بیوی

شوکت تھانوی

بیوی

(ناول)

شوکت تھانوی

C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

نام کتاب : بیوی (ناول)
مصنف : شوکت تھانوی
سن اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت عام ایڈیشن : [redacted]
قیمت لائبریری ایڈیشن : =/130 روپئے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔ 32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

ISBN-81-88645-17-6

BIWI
By.: Shaukat Thanvi
Aam Edition Price : [redacted]
Library Edition Price : Rs.130/=
Edition : 2009
RAHI KITAB GHAR
C-20, Jyoti Colony, Loni Road,
Shahdara, DELHI-110032
(O)22593249
Sole Distributors:-
KITAB WALA
2794, Gali Jhot Wali,
Pahari Bhojla, DELHI-110006
Ph.: (O)2328 1499, 9810277298

انتساب

میری بیوی کے نام
جو میرے لیے سسرال کی
پہلی اور آخری سیڑھی ہے

شوکت تھانوی

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام نام، واقعات، کردار، اور مقامات قطعی فرضی ہیں۔ کسی زندہ یا مردہ شخص سے مطابقت محض اتفاقیہ امر ہوگی، جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

(۱)

یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو بیویوں اور سلیپروں میں بغیر غور کیے امتیاز ہی نہیں کر سکتے اور نہ ان بزرگوں سے بحث ہے جو مجازی خدا تو قانوناً ہیں مگر نجی طور پر سچ مچ کے خدا بنے ہوئے ہیں۔ خیر سچ مچ کے خدا تو وہ کیا بنتے مگر بیویوں کو بندگی کا خوگر ضرور بنا دیا ہے اور بیویوں کی بندگی ان کی واقعی خدا بن جانے پر ہمیشہ اکسایا کرتی ہے۔ ایک قسم شوہروں کی وہ بھی ہے۔ جس کے نزدیک بیوی ایک ایسا انسانی شکل کا جانور ہوتی ہے، جسے پالنے کا عام طور پر شوہروں کو شوق ہوتا ہے۔ اب یہ شوہروں کی مرضی پر ہے کہ وہ اپنے اس پالتو جانور کے ساتھ محبت کا سلوک کرے، بیگانگی کا برتاؤ کرے، یا محض صیاد بنا بیٹھا رہے۔ ان سب کے علاوہ شوہروں کی ایک نسل جو ہمارے یہاں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اس نسل کے تمام بزرگ اپنے اپنے وقت میں شوہر ہو گزرے ہیں اور یہ خاندانی روایت چلی آ رہی ہے کہ تمام مردوں کی ایک نہ ایک عورت سے شادی کر دی جاتی ہے اور وہ اس کے شوہر کہلاتے ہیں، لہٰذا خاندانی وضع کے مطابق وہ بھی شادی کر کے ایک عورت کے شوہر بن بیٹھتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ اس بے چارے کو کچھ خبر نہیں۔ مختصر یہ کہ ایسی ایسی ہزاروں قسمیں ہیں۔ بلکہ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سانپوں کی اور شوہروں کی قسمیں گنتی میں آ ہی نہیں سکتیں۔ مگر فیاض صاحب اپنی قسم کے پہلے شوہر تھے۔ نہ ایسا شوہر سنا نہ کبھی دیکھا۔ صورتاً نہایت شریف، ہر معاملے میں سلجھے ہوئے۔ ضرورت کے وقت نہایت سنجیدہ،

وقت پڑنے پر نہایت دلچسپ۔ کبھی علم و فضل کے بحرِ ناپیدا کنار، کبھی ایسے ہنس مکھ کہ باغ و بہار، کبھی محفل شعر و ادب کی جان، کبھی سیاسی اجتماع میں مزید الجھنوں کے سامان، مختصر یہ کہ قدرت نے آپ کو عجیب معجون مرکب بنایا تھا۔ خیر ان کی باقی باتیں تو مرکھپ کر برداشت کی جاسکتی تھیں مگر بیوی کے سلسلہ میں دن رات ان کی رہنمائی قبول کرنا کسی ایسے شخص کے امکان میں نہیں ہوسکتا جو اپنی بیوی کے سلسلہ میں اپنی پالیسی کو خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہو۔ اور جس کا عقیدہ یہ ہو کہ ہم میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر کسی نقاد کو تنقیدی نظر ڈالنے کا اس لیے کوئی حق نہیں ہے کہ یہ میاں بیوی کے تعلقات ہیں اور بقول بڑی بوڑھیوں کے میاں بیوی کی بات میں کوئی کیوں بولے۔ مگر فیاض صاحب تھے کہ بولتے تھے۔ بولتے ہی نہیں تھے بلکہ اس سلسلے میں زندگی نے عاجز کر رکھا تھا۔

تمہید کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس بات میں شرم کی ضرورت ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک شریف شوہر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔ ڈرنا ویسے بھی شرافت کی علامت ہے۔ خدا کا شریف بندہ وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ حاکم کا شریف محکوم وہ ہے جو حاکم سے ڈرے۔ باپ کا سب سے اچھا بیٹا وہ ہے جو باپ سے ڈرے۔ اسی طرح بہترین شوہر وہ ہے جو بیوی کو ڈرانے کی بجائے بیوی سے ڈرنے کا قائل ہو۔ مختصر یہ کہ ہم تو اپنی شرافت سے مجبور تھے اور فیاض نے اس شرافت کے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے تھے۔ زن مرید، بیوی کے پالو، اعزازی شوہر، بیوی کی بیوی، اور نہ جانے کیا کیا۔ آخر ایک دن جل کر ہم نے بھی کہا۔

”آخر آپ کے نزدیک شوہر کو کیا ہونا چاہیے۔“

فیاض نے بے پرواہی کے ساتھ کہا۔ ”شوہر کو کم سے کم شوہر تو ہونا ہی چاہیے۔“

ہم نے کہا۔ ”وہ تو میں ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے کس قسم کا شوہر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

فیاض نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اور اپنے چہرے پر لکچر دینے کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں آپ کو وہم ہوگیا ہے کہ آپ شوہر ہیں میں آپ کو کس قسم کا شوہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ سوال تو آپ کیجئے گا اپنی بیگم صاحبہ سے۔ البتہ میں آپ کو انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر دیکھ یہ رہا ہوں کہ آپ کی انسانیت بھی رفتہ رفتہ زنگ آلود ہوتی جاتی ہے۔ کم سے کم آپ اشرف المخلوقات میں سے تو اب ہیں نہیں۔ بیوی کو اپنے اوپر اس حد تک طاری کرلیا ہے کہ اپنا شوہر ہونا بھول کر آپ بجائے خود نہایت غیر محسوس طریقہ پر بہت تیزی کے ساتھ بیوی بنتے جارہے ہیں۔ نہ آپ کی رائے آزاد ہے نہ آپ کا کوئی عمل آزاد ہے نہ آپ خود آزاد ہیں۔“

ہم نے اس لکچر سے گھبرا کر کہا۔ ”کس قدر غیر شاعرانہ بات کہہ رہے ہو فیاض۔ کیا تم اس لطافت کو واقعی محسوس نہیں کرتے کہ ایک عورت ایک مرد کی زنجیر بن جائے۔“

فیاض نے شرارت سے یا خدا جانے سنجیدگی سے کہا۔ ”زنجیر تک تو غنیمت تھا۔ مگر وہ لگام بنی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بیوی کو محتسب بنا کر ایک شخص زندگی کیونکر بسر کرسکتا ہے۔

ہم نے کہا۔ ”ایک مرتبہ تجربہ کرکے دیکھو۔ اپنے کو بس بھابی کے سپرد کردو۔ پھر دیکھو کہ تم کو کس قدر یکسوئی حاصل ہوگی۔ نہ گھر کے کسی جھگڑے سے سروکار، نہ نون، تیل لکڑی کی فکر۔ نہ کسی اور بات کا غم۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے لیے موزے اور بنیان تک تمھاری بھابی ہی خریدتی ہیں۔ اور میں خوش ہوتا ہوں کہ وہ کس

محبت سے میرے لیے ہر چیز خرید کرلاتی ہیں۔‘‘

فیاض نے تحقیر کے ساتھ کہا۔ ’’یہ تو ہے۔ اس بات کا تھوڑا بہت تجربہ مجھ کو بھی ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں نے ایک نہایت خوبصورت زنجیر اپنے کتے کے لیے خریدی اور جب وہ زنجیر پہنا کر میں اسے اپنے ساتھ چہل قدمی کے وقت لے گیا تو وہ بھی خوش تھا اور میں بھی۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’آپ نے اپنے نزدیک بہت بڑا حملہ کیا ہے۔ مگر میں آپ کو سنجیدگی کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ اپنے کو سپردگی میں دے کر دیکھو کہ تمھارا گھر، جن میں تمھارا دل مجھے معلوم ہے کہ نہیں لگتا۔ کس حد تک تمھارے لیے جنت بن جاتا ہے۔‘‘

فیاض نے وحشت سے کہا۔ ’’بھئی خدا محفوظ رکھے اس جنت سے کہ گھر کے علاوہ باقی تمام دنیا بے کار ہو کر رہ جائے۔ ممکن تھا کہ میں آپ کے اس مشورے پر عمل کرنے کی حماقت کر گذرتا مگر میرے سامنے ایک درسِ عبرت آپ کا نمونہ موجود ہے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’تو کیا آپ کے خیال میں میری زندگی بہت تکلیف دہ ہے۔‘‘

فیاض نے اس طرح وثوق کے ساتھ کہا گویا زندگی ہماری ہے مگر بسر وہ کر رہے ہیں۔ ’’یقیناً تکلیف دہ ہے اس سے بڑھ کر اور تکلیف دہ کیا ہوگی کہ آپ کو اس تکلیف کا احساس بھی باقی نہیں ہے۔ دنیا کی تمام دلچسپیاں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ مگر قدرت نے آپ کو ان سے محروم کر رکھا ہے اور پھر لطیفہ یہ ہے کہ اس محرومی کا بھی آپ کو شکوہ نہیں، بلکہ حیرت یہ ہے کہ آپ خوش ہیں۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’غلط بیانی زیب داستان کے لیے ہے تو خیر ورنہ یہ آپ نے کیونکر سمجھا کہ میں کسی دلچسپی میں حصہ ہی نہیں لیتا۔ جس بات پر آپ برہم ہوئے ہیں۔ یعنی سنیما نہ جانے پر اسی کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ میں اکثر سنیما جاتا رہتا ہوں۔‘‘

فیاض نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ’’خیر خیر۔ میں نے بھی دوا کے طور پر اکثر انگور کھائے ہیں۔ اور ان میں بھی انگوروں کا ذائقہ محسوس نہیں کیا۔ آپ سنیما گئے بھی تو کس طرح۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ۔ دنیا کے کسی خوش مذاق، کسی عقل مند اور کسی تمیزدار آدمی سے پوچھ لو۔ کہ سائیس کے ساتھ ٹہلنے میں گھوڑے کو کبھی لطف آ سکتا ہے۔ وہ گھاس پر لوٹتا بھی ہے تو رسی سائیس کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہائے اس کا کیا کیا جی چاہتا ہوگا سرپٹ بھاگنے کو۔ دولتی اچھالنے کو۔ اچھلنے کو۔ اِدھر اُدھر کودنے کو، مگر سائیس اس کے گلے میں رسی باندھ کر جس وقت اسے تفریح کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس وقت وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ نہایت شائستگی سے لوٹ لے۔ کیا آپ کے نزدیک گھوڑے کی یہ تفریح کافی ہے اور اگر گھوڑا خود کہے کہ میں اسی حال میں خوش ہوں تو کیا آپ مطمئن ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ آپ ہو جائیں۔ مگر ایک گھوڑے کے اس بیان پر کوئی گھوڑا ایمان نہیں لا سکتا۔ میں یہ کیسے سمجھ لوں کہ جس طرح جناب والا سنیما جاتے ہیں۔ یا دوسری تفریحات میں حصہ لیتے ہیں، وہی آپ کے لیے کافی ہے۔ یہ بھی کوئی تفریح میں تفریح ہوئی کہ ساتھ میں ہیں سائیس صاحبہ اور آپ چلے جا رہے ہیں نہایت سعادت مندی سے ساتھ ساتھ، ہاتھ پر بیگم صاحبہ کی شال یا چسٹر ڈالے۔ ہرے پر اردلی ہونے کا پورا سلیقہ پیدا کیے ہوئے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار قسم کے انداز سے۔ نہ کسی سے ہنس سکتے ہیں۔ نہ بول سکتے ہیں، بولنا بھی پڑا تو نپی تلی واجبی سی باتیں۔ خدا کے لیے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ تفریح ہے یا حبس دوام بعبور دریائے شور۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’بک چکے تم۔ اب سنو۔ تم اس کو اس لیے پابندی سمجھتے ہو کہ

تمھاری ذہنیت مجرمانہ ہے اور میں نے اسی پابندی کو اپنی عادت بنالیا ہے۔ لہٰذا اب مجھے بیوی کی موجودگی قطعاً محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اگر موجود نہ ہوں تو ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ میں دراصل زندگی میں اس شائستگی کو طبعاً پسند کرتا ہوں جو بیوی کی موجودگی میں انسان کو مجبوراً برتنا پڑتی ہے۔“

فیاض نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ”کیوں بنتے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم جس قدر مہذب ہو۔ کہو تو قسم کھا کر کہہ دوں کہ تم میں وہ تمام شوخیاں، وہ تمام تیزیاں اور وہ تمام سرمستیاں موجود ہیں جو ایک نوجوان میں ہونا چاہئیں۔ مگر ان تمام بیساختگیوں کو کچل کچل کر رکھتے ہو۔“

ہم نے اس بحث سے عاجز آ کر کہا۔ ”خدا کے لیے اب میری جان بخش دو۔ میں ان تمام شوخیوں، تمام تیزیوں اور ہر بات کا قائل ہوں مگر......“

فیاض نے بات کاٹ کر کہا۔ ”مگر بیگم صاحبہ کی موجودگی میں۔ پاسبانِ عقل کے ساتھ۔ اقبالؔ نے تو کبھی کبھی تنہائی کا مشورہ بھی دیا ہے۔ مگر جناب اس کے بھی قائل نہیں ہیں۔“

ہم نے اپنے نزدیک بہت بڑی بات کہی۔ ”دیکھو فیاض، دنیا کا سب سے بے تکلف اور سب سے زیادہ دلچسپ رشتہ بیوی کا ہے بیوی سے بڑا دوست کون ہو سکتا ہے۔ اگر انسان بیوی کے سامنے بے تکلف نہ ہو سکا تو پھر کس کے سامنے ہوگا۔“

فیاض نے گویا ہماری طرف سے صبر کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوتے ہوں گے آپ بے تکلف اور اس بے تکلفی سے ہم کو کوئی غرض بھی نہیں ہے۔ یہاں ذکر تو اس بے تکلفی کا ہے جو بیوی کی موجودگی میں آپ دوسروں کے ساتھ برت سکیں اور جس کے متعلق میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ لاکھ چاہیں مگر دل کھول کر بے تکلف ہو ہی نہیں سکتے۔ اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ بہرصورت اس قصہ کو اس طرح مختصر کیا جا سکتا ہے۔ اب آپ کی انفرادی حیثیت سے ہم سب صبر کر لیں۔ آپ بیگم صاحبہ کے حاضر و غائب شوہر ہونے کے علاوہ ہم لوگوں کے لیے گویا بالکل بے کار ہو چکے ہیں۔“

فیاض کی گفتگو اسی حد تک پہنچی تھی کہ ملازمہ نے اندر سے ایک پرچہ لا کر دیا اور فیاض نے اس پرچہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے ٹوپی اٹھا کر پَر تولتے ہوئے کہا۔ تشریف لے جائیں جناب اب یہ خاکسار محض اس دن اور اس وقت حاضر خدمت ہو سکے گا۔ جب دنیا میں کوئی کام ہی نہ ہو اور وقت ضائع کرنے کو ایسا ہی دل چاہ رہا ہو۔ السلام علیکم۔“

(۲)

قصہ دراصل کچھ اور ہی تھا۔ احباب میں تاویل پیش کرنے کو لاکھ کہہ دیں کہ بیوی کا ضمیمہ بن کر رہ جانے سے ہم مطمئن ہیں اور یہ پابندیاں ہم کو محسوس نہیں ہوتیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ فیاض کہتا ٹھیک تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کو برج کا بے انتہا شوق، دن رات کہیے تو بھوک پیاس بھول برج کھیلتے رہیں۔ بیگم صاحبہ کو ویسی ہی برج سے نفرت۔ ان کا بس چلے تو برج کے موجد کو ایسا کوسیں کہ اس کا خودکشی کو دل چاہنے لگے۔ پھر تقاضہ یہ کہ آپ کو تاش کھیلنے کا ایسا ہی شوق ہے تو آیئے میرے ساتھ کھیلئے۔ اب بتایئے کہ کون ان کے ساتھ غلام چور یا زیادہ چانس کھیل کر اپنے اس ذوق کو تسکین دے سکتا ہے۔ ہم کو شکار کا خبط اور وہاں یہ ضد کہ ہم بھی چلیں گے۔ اب یا تو انتظام کیا جائے کہ شکاری جانوروں کو پرچہ لکھ کر بھیج دیں کہ چونکہ ہمارے گھر میں سے بھی شکار پر آئی ہوئی ہیں۔ لہٰذا تم لوگ خود ہمارے کیمپ تک آکر گولی کھا جاؤ، ورنہ ہم شکار سے اس لیے معذور سمجھے جائیں کہ بیگم صاحبہ گھنے جنگلوں میں جھاڑ جھنکار کے درمیان سے اپنی جارجٹ کی ساری یا اپنا شیمون کا دوپٹہ بچا کر نہ گزر سکیں گی اور اگر گزر بھی جائیں تو بھی تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ تھک جائیں گی۔ ان کے لیے پانی ڈھونڈنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ پاؤں میں موچ آجائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دھڑکن شروع ہوجائے ورنہ سر میں درد تو ہو ہی سکتا ہے۔ ان تمام حالات کے ماتحت یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام شکاری جانوروں کو اطلاع دے دی جائے کہ وہ خود ہی شکار ہونے کے لیے آجائیں۔ تاش اور شکار کے علاوہ واقعی کبھی کبھی یہ دل چاہتا ہے کہ اپنے بے تکلف احباب میں بیٹھ کر ہاہا، ہوہو کی جائے جس کو یہ عورتیں ہڑدنگا کہا کرتی ہیں یا زیادہ جل کر کہیں تو شہدپن تک کہہ دیتی ہیں۔ اب بتایئے کہ اس شہدپن کے لیے وقت کہاں سے نکالا جائے۔ انسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈسپلن کا پابند تو نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہر وقت وردی پہنے کمر باندھے پھر رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنی نجی زندگی بسر کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ عورتوں کا کیا ہے وہ تو پردے کے بہانے سے آپس میں ہر قسم کی بے تکلفی برت لیا کرتی ہیں، جس کی مردوں کو بھی خبر نہیں ہوتی یعنی مرد تو جھانک کر بھی اس بے تکلفی کو نہیں دیکھ سکتے۔ مگر مردوں کی بے تکلفی کو جھانکا جاسکتا ہے اسی لیے مرد نہ صرف ''دیوار گوش دارد'' کے قایل ہوتے ہیں بلکہ ''دیوار دیدہ دارد'' کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ تو قصہ مختصر اس طرح ہوتا ہے کہ فیاض صاحب کے سامنے ہم بن تو بہت لیے مگر یہ واقعہ ہے کہ فیاض نے وہی سب کچھ کہا تھا جو ہم چپکے چپکے شادی کے بعد سے برابر سوچا کرتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ کوئی شروع ہی میں بیوی سے مرعوب ہوجائے۔ پھر تو وہ زندگی بھر سر اٹھا ہی نہیں سکتا۔ اس وقت بھی دل تو چاہا کہ فیاض کے گلے میں باہیں ڈال کر خوب روئیں مگر ہم کو یقین تھا کہ اس گفتگو کو بھی سنا جارہا ہوگا۔ لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ ہم نے فیاض سے اس قسم کی گفتگو کی۔ ہمارا یہ خیال دیکھئے کس حد تک صحیح نکلا۔ ہم کو جو پرچہ بھیج کر باہر سے بلوایا گیا تھا، اس کا مقصد اسی گفتگو کے متعلق ہماری پیشی تھی۔ چنانچہ ہم جس وقت حاضر ہوئے ہیں، سرکار اپنی پوری شگفتگی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ دل کو اطمینان ہوگیا کہ بفضلہٖ سب خیریت ہے۔ ہمارے پہنچتے ہی آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا گئے فیاض صاحب''۔

ہم نے بے پرواہی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں تشریف لے گئے

مگر دماغ کی وہ تمام صلاحیت جس کا تعلق سمجھ بوجھ سے ہے اپنے ہمراہ لیتے گئے ہیں۔“

بیگم صاحبہ نے ہاتھ پکڑ کر ہم کو ہم نشینی کا شرف عطا کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر آپ اپنے دوستوں کو میری وجہ سے کیوں ناراض کیے ہوئے ہیں۔ میں تو کبھی منع نہیں کرتی کہ آپ دوست احباب میں نہ جائیں۔“

دیکھا آپ نے یہ سفید جھوٹ! مگر اس سے زیادہ براق جھوٹ ملاحظہ ہو کہ ہم نے ذرا ابرا مان کر کہا۔ ”گویا دوست احباب آپ سے بڑھ کر ہیں میرے لیے، سبحان اللہ۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ان سب نے ایک ایک بیوی گھر میں لا کر بند کر رکھی ہے اور خود باہر گل چھرے اڑاتے پھرتے ہیں وہی میں بھی کروں۔“

بیگم نے سند عطا کرنے کے انداز سے فرمایا۔ ”خیر گل چھرے تو آپ اڑا ہی نہیں سکتے۔ مگر مجھے تو حیرت ہے ان عورتوں پر جو اپنے شوہروں کے طرزِ عمل کے بعد بھی مطمئن رہتی ہیں۔“

ہم نے الفاظ کو پورے زور کے ساتھ کہا۔ ”مطمئن کیا خاک رہتی ہوں گی بس یہ کہیے کہ زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔ خیر آپ کو تو ان عورتوں پر حیرت ہے مگر مجھے ان مردوں پر تعجب ہے کہ یہ بیرونی دلچسپیوں کے کیونکر عادی ہو گئے ہیں۔ اب فیاض ہی کو دیکھ لیجیے، کوئی بھی اسے دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اس کے گھر پر ایک بیوی بھی بندھی ہوئی ہے۔“

بیگم نے سخن فہمی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”بندھی ہوئی ہے۔ بہت خوب کہا۔ مگر میں تو چاہتی ہوں کہ فیاض صاحب کی بیوی سے مل کر یہ اندازہ کروں کہ وہ کس قسم کی عورت ہے۔ فیاض صاحب کو جوان سے دلچسپی نہیں ہے۔ اصل میں قصور کس کا ہے۔ فیاض صاحب کا یا ان کا۔“

ہم نے کہا۔ ”اس بے چاری کا کیا قصور ہو گا۔ آپ کو دراصل معلوم نہیں کہ یہ مرد کی ذات کیسی خود غرض، خود بین اور خود پسند ہوتی ہے۔“

بیگم نے ایک ادبی جملہ فرمایا۔ ”مگر عورت کو بھی تو خوددار ہونا چاہیے۔ بہر صورت آپ مجھے کسی طرح فیاض صاحب کی بیگم سے ملا دیجئے۔“

ہم نے آمادہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب کہیے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ میرے احباب کی بیویوں سے میل بڑھائیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ آپ کی بہنوں کو ہمارے بھائیوں نے کس کس طریقہ پر قید کر رکھا ہے۔“

اب بیگم صاحبہ آخر کب تک رواداری کا غازہ مل کر خوش اخلاقی فرماتی رہتیں۔ رفتہ رفتہ فیاض کے متعلق کھلنے لگیں۔ ”مگر یہ فیاض صاحب مجھے اچھے آدمی نظر نہیں آتے اور چاہتے یہ ہیں جیسے وہ خود ہیں اسی طرح کے سب ہو جائیں۔“

یہ بات ذرا خطرناک تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ عنقریب فیاض کو نہایت جرائم پیشہ، حد درجہ کا آوارہ وغیرہ کہہ کر ہم کو قطعی طور پر منع کر دیا جائے گا کہ اس کی بری صحبت سے بچیں۔ اور آئندہ کبھی اس سے ملتے ہوئے نہ پائے جائیں۔ لہٰذا ہم نے عاقبت اندیشی سے کام لے کر عرض کیا۔ ”واقعی عجیب طبیعت پائی ہے۔ تعجب تو یہ ہوتا ہے کہ کمبخت جتنا برا نہیں ہے، اتنا برا اپنے آپ کو ثابت کرتا رہتا ہے۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ تاش کا کوئی کھیل نہیں جانتا۔ غیر عورتوں سے اس طرح شرماتا ہے جیسے عورتیں نامحرموں سے شرماتی ہیں۔ یوں تو قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ مگر کسی عورت سے بات کریں گے تو معلوم ہو گا پیدائشی ہکلے ہیں۔ جس طرح کوئی سورج سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا، یہی حال جناب کا عورتوں کے سلسلہ میں ہے۔“

بیگم نے بات کاٹ کر کہا۔ ”پھر آخر وہ کیوں مرے جاتے ہیں۔ ان کا دل یہ کیوں چاہتا ہے کہ تمام دنیا کے مرد اپنی اپنی بیویوں کو طلاق دے کر آزاد ہو جائیں۔“

بیگم نے آخر اپنے رنگ میں شعر کہنے شروع کر دیئے۔ لہٰذا ہم نے بھڑکنے والی آگ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ارے نہیں، نہیں، نہیں، طلاق ولاق کچھ نہیں، یہ اس کا مطلب نہیں ہو سکتا۔"

ایک دم سے بلبلا کر بولیں۔ "مطلب نہیں ہو سکتا۔ صاف یہی مطلب تھا۔ میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو بیویوں سے چھپا کر آپ لوگ کرنا چاہتے ہیں اور بیویوں کی وجہ سے ایسے مجبور ہو گئے کہ بیویاں وبال بن کر رہ گئی ہیں۔ سنیما جانے کے لیے میں خود آپ سے کہتی ہوں کہ چلئے سنیما ہو آئیں۔ پکنک، دوستوں کی دعوتیں، سیر سپاٹے سب ہی کچھ تو ہوتا رہتا ہے۔ میں ہر بات کا خود خیال رکھتی ہوں۔ مگر اس پر بھی صاحب نام یہ ہے کہ بیوی سے دبے ہوئے ہیں۔ بیوی کے قیدی ہیں، بیوی باندھ کر رکھتی ہے۔ آخر یہ بیوی کا رونا کیوں رویا جاتا ہے۔"

جل تو جلال تو صاحبِ کمال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ طوفان شروع ہو چکا تھا۔ ایسے طوفان کا مقابلہ اور مرد کی جانِ ناتواں۔ توبہ کیجئے۔ مگر ہم کو بھی کچھ عمل آتے تھے۔ فوراً اس بپھری ہوئی شیرنی کا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کہا۔ "تو کیا میں بھی دنیا کے دوسرے مردوں کی طرح ہوں۔ کیوں؟"

بیگم پر فوراً اثر ہوا۔ ایک دم دھیمی پڑ کر آواز میں گرج کی بجائے کھنک پیدا کر کے کہا۔ "اللہ نہ کرے۔ مگر یہ لوگ تو یہی چاہتے ہیں کہ جیسے درندے یہ خود ہیں ویسا ہی سب کو بنا دیں۔ اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ فیاض صاحب کی بیوی سے مجھ کو فوراً ملا دیجئے۔ میں ان سے کہوں گی کہ بہن یا تو اپنے اس مردوئے کو آدمیوں میں بیٹھنے کے قابل بناؤ۔ انسانیت سکھاؤ۔ ورنہ باندھ کر رکھو۔"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ دوسروں کے شوہروں کو جنگلی بناتا پھرتا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ میں مسز فیاض سے ملانے کی ترکیب کرتا ہوں۔ مجھے تو خود حیرت

ہے کہ وہ کس قسم کی عورت ہیں۔ سنا ہے کہ اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ فیاض صاحب نے رومان میں مبتلا ہو کر ان سے شادی کی تھی۔ کیوپڈ نے نکاح پڑھایا تھا۔ شروع شروع میں فیاض صاحب زمین پر پیر ہی نہ دھرتے تھے۔ اس کثرت سے بیوی کے فضائل بیان ہوتے تھے کہ ہم سب کو ان کی بیوی سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ یا تو وہ شوراشوری تھی یا اب یہ بے نمکی ہے۔"

بیگم نے منہ بنا کر کہا۔ "طوطے۔ بالکل طوطے۔ یہ مرد سب کے سب طوطے ہوتے ہیں۔ ایسی آنکھ پھیرتے ہیں کہ......"

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "کہ بس نبی جی بھیجو مدد اللہ کی۔"

بیگم کو اخلاقاً یا انتظاماً ہنسی آ گئی۔"

(۳)

گھر میں تو مسز فیاض اور بیگم سر جوڑ کر کچھ مشورے کر رہی تھیں اور باہر فیاض سے ہم سر کھپا رہے تھے۔ فیاض اس وقت بھی ہماری زن مریدی کا رونا مسلسل رو رہا تھا اور ہم خوش تھے کہ بیگم یقیناً اس کے حق میں ایسے کانٹے بو رہی ہوں گی کہ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ فیاض ؔپچھتر فی صدی حق بجانب تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے اس کو شریف قسم کا شوہر نہیں بنایا تھا اور ہم کو اس وصف سے مالا مال کر کے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ ہم اور وہ دونوں اپنے اپنے اصولوں میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ وہ بیوی کو مرعوب کر کے ایسا مستقل قسم کا جری شوہر بن چکا تھا کہ ازدواجی معاملہ میں اس سے کسی نیاز مندی کی توقع ہی بے کار تھی اور یہاں یہ حال تھا کہ سرِ تسلیم اس زاویہ تک جھک چکا تھا جہاں سے سرکشی کے تمام امکانات رخصت ہو جاتے ہیں۔ فیاض کی بیوی فیاض کی حکومت تسلیم کر کے سپر ڈال چکی تھی اور ہم اپنے یہاں اپنی مٹی ایسی پلید کر چکے تھے کہ اب اگر رعب جمانے کی کوشش بھی کریں تو بیگم کو ہماری اس اداکاری پر یقیناً ہنسی آ جائے گی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بقول فیاض کے امنگیں ابھی تک زندہ تھیں اور دل چاہتا تھا کہ زندگی کے کچھ لمحے اپنے ذاتی بھی ہوں۔ لیکن ان لمحوں کے لیے یا تو اب چوری کی جائے یا جھوٹ بولا جائے۔ مجرمانہ پردہ داریاں کی جائیں۔ ورنہ بیگم کے لبوں پر موجِ تبسم کی بجائے نگاہوں میں شعلے، ابروؤں میں زلزلے، تنفس میں جوار بھاٹا وغیرہ برداشت کیا جائے۔ آسان ترکیب یہی تھی کہ سرکشی

کی بجائے تھوڑا بہت لفنگاپن اختیار کیا جائے۔ مدتیں ہو چکیں کہ تاش کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ رمی کی محفل آراستہ کی جائے۔ دل کھول کر بازیاں لگیں۔ ذرا معقول رقم کی ہار جیت ہو اور اس کے لیے آج سے بہتر موقع بھی اور کون سا ہو سکتا تھا۔ فیاض کی بیوی گھر میں تھیں۔ گویا ہم ایک حیثیت سے چھٹی ہی پر تھے۔ مگر ہارنے کے لیے رقم؟ دیر تک مختلف تدابیر پر غور کرتے رہے۔ آخر فیاض نے زور دے کر کہا۔

’’آخر کوئی فیصلہ کر چلو نا۔ جب تمام یارانِ میکدہ اپنے اپنے گھر سے نکل گئے تو پھر کہاں ان کو ڈھونڈھا جائے گا۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’بھئی ذرا دم تو لو۔ چلنا تو خیر طے ہے ہی مگر سوال یہ ہے کہ روپیہ کا کیا انتظام کیا جائے۔‘‘

فیاض نے حیرت سے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’کیا مطلب؟ یعنی سال سوا سال کے بعد کھیلنے کے لیے بھی آپ کے پاس روپے نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر تم اتنے منحوس کیوں ہوتے جاتے ہو۔ تم تو روز کے کھیلنے والے تھے اور کلب کے چند نامی گرامی ہارنے والوں میں تمھارا نام ہمیشہ آبِ زر سے لکھا رہا ہے، مگر میں نے تمھارے منہ سے کبھی روپیہ کے متعلق انتظام کا لفظ نہیں سنا۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ منور کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب تو روپیہ مانگنا پڑے گا۔ لہٰذا یہ بتاؤ کہ کیا کہہ کر مانگا جائے۔‘‘

فیاض نے اپنی معمولی آواز میں کہا۔ ’’کہہ دو جا کر تاش کھیلنا ہے۔‘‘

ہم نے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ’’خدا کے لیے ذرا آہستہ بولو۔ بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔ تم لاکھ کہو مگر مجھ سے اتنا بڑا سچ کبھی نہ بولا جائے گا۔‘‘

فیاض نے حقارت سے کہا۔ ’’لعنت ہے اس زندگی پر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ

جناب نے انڈیمان جانے کے بجائے شادی کرنا کیوں پسند فرما لیا۔’’

ہم نے اپنی بے چارگی کا خود مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ‘‘جب حبس دوام گھر بیٹھے حاصل ہو تو بعبور دریائے شور کی کیا ضرورت ہے، بہر حال اب جلد کوئی ترکیب بتاؤ۔’’

فیاض نے بغیر غور کیے ہوئے کہا۔ ‘‘اونھ! ہزار ترکیبیں ہیں۔ جا کر کہہ دو کہ کالج میں جلسہ ہے اور تمام اولڈ بوائیز کو خاص طور پر بلایا گیا ہے، غالباً چندہ بھی دینا پڑے گا۔ سو روپے سے کم میں جان نہ چھوٹے گی۔’’

ہم نے فیاض کی اس مجرمانہ ذہنیت کی دل ہی دل میں داد دی اور اسی ترکیب کو ذرا اور خوبصورت بنا کر زنانے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ بیگم کو ملازمہ سے بلوا کر کہا۔ ‘‘میں ذرا کالج تک جا رہا ہوں۔’’

بیگم نے جملہ پورا بھی نہ ہونے دیا۔ ‘‘کتنی دیر میں واپسی ہو گی۔’’

ہم نے علی الحساب کہہ دیا۔ ‘‘امید ہے کہ چائے کے وقت تک آ جاؤں گا۔ کالج میں آج اولڈ بوائیز ڈے ہے اور تجویز یہ ہے کہ کالج کے احاطہ ہی میں اولڈ بوائیز کی طرف سے ایک بورڈنگ ایسا بنا دیا جائے جس میں نادار طالب علم رہ سکیں۔ مجھے خاص طور پر بلایا گیا ہے اور غالباً چندہ بھی دینا پڑے گا۔ مگر میں اس وقت تو سو روپیہ سے زیادہ نہ دوں گا۔’’

بیگم نے کہا۔ ‘‘ہاں ہاں تو جو مناسب سمجھئے گا، کیجئے گا۔’’

ہم نے جلدی سے کہا۔ ‘‘میرا مطلب یہ تھا کہ چندہ تو دینا ہی پڑے گا نا۔’’

بیگم نے کہا۔ ‘‘تو چیک بک لاؤں۔ یا آپ نام لکھوا دیجئے گا۔ رقم جاتی رہے گی بعد میں۔’’

اب بتائیے ایسے موقع پر کیا کہا جائے۔ مگر واہ، رہی سہی ذہانت، ہم نے فوراً کہا۔ ‘‘نہ نہ میں تو یہ کروں گا کہ سو روپے کا پرس فوراً پیش کر دوں گا نقد دینے کا اثر یہ پڑتا ہے کہ دوسرے بھی نقد دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تو پھر بھیڑ چال ہوتی ہے نا۔’’

بیگم نے از راہِ کرم فرمایا۔ ‘‘میں سو روپے لائے دیتی ہوں۔ اچھا تو بتائیے کہ فیاض صاحب یہیں رہیں گے۔’’

ہم نے کہا۔ ‘‘معلوم نہیں مجھے مگر غالباً وہ بھی جائیں گے۔ کالج تو ان کو بھی جانا ہوگا۔’’

بیگم نے جاتے ہوئے کہا۔ ‘‘اچھا آپ ٹھہر جائیے۔ میں روپے نکال لاؤں۔’’

ہم اپنی کامیابی پر تو خوش تھے مگر ضمیر برابر ملامت کر رہا تھا۔ ہم نے ضمیر کو لوریاں دے کر سلانے کی کوشش کرتے ہوئے نہ جانے کیا گنگنانا شروع کر دیا تا کہ اتنے میں بیگم نے سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ ‘‘مسز فیاض کو تو خبر بھی نہیں کہ آج اولڈ بوائیز ڈے ہے۔’’

ہم نے کہا۔ ‘‘کیا بات کہی ہے آپ نے۔ گویا فیاض میری طرح اپنا پروگرام بتاتے ہی تو ہوں گے اپنی بیوی سے۔’’

بیگم نے کہا۔ ‘‘مسز فیاض سچ مچ اس قابل ہیں کہ ان کی مدد کی جائے۔ میں نے ان سے تمام حالات معلوم کر لیے ہیں اور اب آپ کو بھی اس معاملہ پر پڑنا پڑے گا۔ فیاض صاحب کی ان تمام زیادتیوں کو ختم ہونا چاہیے۔ ان کو تو دراصل بیوی سے کوئی مطلب ہی نہیں رہا ہے۔ خیر آپ کالج سے ہو آئیے۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔’’

بیگم تو ادھر روانہ ہوئیں اور ادھر ہم فیاض کو لے کر چل دیے اپنے مشغلہ کی فکر

میں۔ طے یہ پایا کہ سیدھے چلیں کلب، چھٹی کا دن ہے زیادہ تر لوگ وہیں مل جائیں گے۔ چنانچہ جس وقت ہم کلب پہنچے ہیں، تقریباً سب جمع تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی سب نے آکر گھیر لیا اور لگے اپنی اپنی بولیاں بولنے۔

رمیش نے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’واقعی یہ تو اب تک کچھ زندہ ہی معلوم ہوتا ہے۔‘‘

اخلاق نے کہا۔ ’’چھوڑ تو نہیں دیا بیوی کو جو یہاں نظر آرہے ہو۔‘‘

مسعود نے دور سے نعرہ بلند کیا۔ اخاہ! یعنی آپ۔‘‘

ٹنڈن نے اپنے مخصوص سنجیدہ انداز سے کہا۔ ’’جناب ہمارا کبوتر چھ مہینے کے بعد ایک دن اڑ کر ہمارے یہاں آگیا تھا۔‘‘

فیاض نے سرخروئی کے ساتھ کہا۔ ’’داد دیجئے مجھ کو کہ اس کو یہاں تک ہکا کر لایا ہوں اور ضمانت کے طور پر اپنی بیوی کو چھوڑا ہے وہاں۔‘‘

اخلاق نے ہم کو ان سب مجمع سے الگ لے جا کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے گویا سرگوشی کے انداز سے کہا۔ ’’کیا واقعی یہ خبر درست ہے کہ ہماری بھابی ہر وقت پہرہ دیا کرتی ہیں۔ آخر یہ آپ عید کا چاند کیوں ہوگئے ہیں۔‘‘

ہم آخر کہاں تک چپ رہتے ہم نے بھی نہایت سنجیدگی سے کہا بھئی بات یہ ہے کہ تم ہوا بھی کنوارے، تمھاری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں۔‘‘

اخلاق نے کہا۔ ’’یہ غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کلب نے متفقہ طور پر یہ ریزولیوشن منظور کیا کہ ایک وفد آپ کی بیگم صاحبہ کے پاس جائے گا اور ان سے اپیل کرے گا کہ وہ آپ کو صرف اپنا شوہر سمجھیں، جائیداد غیر منقولہ سمجھ کر قابض نہ بنیں ورنہ کلب کے ممبر ستیہ گرہ شروع کردیں گے۔‘‘

اتنی ہی دیر میں باقی لوگ بھی آچکے تھے۔ رمیش نے کہا۔ ’’میری رائے تو یہ ہے کہ بجائے اس شریفانہ طرزِ عمل کے ہم لوگ ان حضرات کو اب جانے ہی نہ دیں۔ بھابی کو رخصتی کا دعویٰ کرنے دیں۔‘‘

اس رخصتی کے دعویٰ پر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا۔ مسعود نے اپنی آواز کو اسی شور میں نمایاں کرکے کہا۔ ’’بھابی بے چاری کا تو دراصل صرف اتنا ہی قصور ہے کہ وہ ایک فدوی قسم کے شوہر کی زوجیت میں آگئی ہیں۔ مگر ان حضرات نے تو واقعی مردوں کی ناک کٹوا رکھی ہے۔ اس دور میں ایسا شوہر ڈھونڈنے سے نہ ملے گا کہ بیوی کیا ملی خود ہی کھو گئے، سزا تو ان کو دینا چاہیے۔‘‘

ٹنڈن نے فوراً کہا۔ ’’اور سزا بھی ایسی کہ باقی تمام ہونے والے شوہر عبرت حاصل کریں۔ جس طرح اگلے زمانے میں چوراہوں پر پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ اسی طرح کی کوئی سزا تجویز ہونی چاہیے۔‘‘

اخلاق نے سب کو خاموش کرکے کہا۔ ’’یہ کچھ نہیں۔ ان حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ یہ سیدھی طرح کلب کی حاضری کو اپنے فرائض میں شامل کرنے کو تیار ہیں یا ہم لوگ اس سلسلہ میں مداخلت کریں۔‘‘

رمیش نے کہا۔ ’’آپ ان سے مصالحت کی امید رکھتے ہیں حالانکہ ان کی حالت اب قطعی طور پر ان تمام منزلوں سے گزر چکی ہے۔ میری رائے میں تو مداخلت والا پروگرام شروع ہونا چاہیے۔‘‘

اخلاق نے بڑے مفکرانہ انداز کے ساتھ اپنی اسکیم پیش کرتے ہوئے کہا۔ ’’میری اسکیم کے مطابق ان میاں بیوی کے ازدواجی رشتہ کی عمر اب بہت کم رہ گئی ہے۔ پہلے تو پندرہ دن تک خاموش خاموش، ڈھکی چھپی لڑائی ہوگی۔ ٹھنڈی اور لمبی لمبی سانسوں کا سلسلہ جاری ہوگا۔ آنکھوں میں شکایتیں نشو و نما پاتی رہیں گی۔ دم گھٹتا ہوا اور دل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوگا۔ اس کے بعد ایک دن دو بدو کی ٹھہرے گی۔ صبر کے پیمانے

چھلک جائیں گے۔ قسموں کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ پھر کوئی سوا مہینے کے بعد بکس گھسیٹے جائیں گے۔ بستر بندھیں گے۔ دروازے پر ایک پردہ دار تانگہ کھڑا ہوگا۔ اور آپ کے گھر کی رونق پر تولتی ہوئی نظر آئے گی۔ آپ اپنی وفاداریوں کا آخری بار یقین دلا کر اعلیٰ درجے کے مکار، دغا باز اور فریبی ثابت ہوں گے۔ آپ اپنی بیوفائیوں کے دستاویزی ثبوت پیش کریں گے اور آپ کے پاس خود ان دستاویزوں کو رد کرنے کے لیے نہ الفاظ ہوں گے نہ کوئی اور ثبوت۔ آپ کی بے گناہی خود اپنے گناہ گار ہونے کے یقین میں مبتلا ہو کر رہ جائے گی۔ تانگہ روانہ ہوگا اور آپ کلب آنے کے لیے فارغ۔ پھر دو مہینے کے بعد ادھر سے مقدمے بازی کی دھمکی دی جائے گی اور ادھر سے آرزوئے قدم بوسی کا اظہار ہوگا مگر بے کار۔ اس لیے اس عرصہ میں کچھ اور ثبوت آپ کی اوباشی کے مہیا ہو چکیں گے۔ آخر چھٹے مہینے کے اختتام سے پہلے ہی آپ ہم سب سے مشورہ کریں گے کہ طلاق دینے کی قانونی نوعیت کیا ہے۔''

کمبخت نے ایسا بھیانک نقشہ پیش کیا کہ آخر ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کلب کی غیر حاضری کبھی نہ کروں گا۔''

اخلاق نے کہا۔ ''یہ غلط ہے۔ اس قسم کے وقتی وعدے ہم کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ اگر اس سلسلہ میں آپ کی نیت واقعی پاک ہے تو بسم اللہ یہ کاغذ ہے۔ یہ قلم اور یہ دوات۔ ایک باضابطہ تحریر لکھ دیجئے۔ جو ہمارے قبضہ میں رہے گی اور جب کبھی آپ نے اس تحریر کی خلاف ورزی، کی ہماری طرف سے آپ کو سزا دلوانے کے لیے صرف وہی تحریر کافی ہوگی۔''

ہم نے کہا۔ ''لایئے میں لکھے دیتا ہوں ایک باضابطہ قسم کا اقرار نامہ۔''

مسعود نے کہا۔ ''باضابطہ ہرگز نہیں۔ چرکہ نہ دو۔ ہم لوگ بے وقوف ضرور ہیں مگر اتنے نہیں کہ آپ بھی ہماری بے وقوفی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بیوی سے جا کر کہہ دیں گے کہ احباب نے یہ مذاق کیا ہے اور اس قسم کا ایک اقرار نامہ لکھوایا ہے۔ آپ تو ایک پرائیویٹ خط لکھئے۔ جس میں اپنی بیوی کے مظالم بیان کیجئے اور ان مظالم سے چھٹکارا پانے کی تدبیر دریافت کیجئے۔

اخلاق نے کہا۔ ''میں مسودہ تیار کیے دیتا ہوں، اسی کی نقل کر دیجئے۔''

یہ کہہ کر ان سب نے سر جوڑ کر ایک ایسا مسودہ تیار کیا کہ اگر واقعی اس مسودے کو بیگم دیکھ لیتیں تو ان کا دل پاش پاش ہو کر رہ جائے۔ ہم نے لاکھ چاہا کہ اس مسودے میں ترمیم کرائیں، اس کے الفاظ کو کچھ نرم کرائیں۔ مگر ایک نہ سنی گئی۔ وہاں تو بنوکِ شمشیر تقاضا یہی تھا کہ بس دستخط کر دو۔ چنانچہ اس مسودے کو لکھا اور دستخط کر کے اپنے کو ان شیاطین کے سپرد کرتے ہی بن پڑی۔

اس تمام کارروائی کے بعد ان لوگوں کو چین آیا اور اب بمشکل تمام کھیل شروع ہو سکا۔ ہماری عدم موجودگی میں تو یہاں پوکر کٹی، برج اور نہ جانے کیا کیا کھیل ہوتے رہے تھے۔ مگر آج سب نے ہماری وجہ سے رمی کو ترجیح دی اس لیے کہ تاش کے کھیلوں میں ہمارا سب سے پسندیدہ کھیل یہی ہے۔

کھیل ہوتا رہا۔ کبھی جیتے۔ کبھی ہارے اور آخر جب ہم نے چائے کے وقت کے قریب اجازت طلب کی اور فیاض نے بھی ہماری تائید کی تو ہم ساٹھ ستر روپے جیت پر تھے۔ فیاض کے مشورے کے مطابق تو ہم نے یہ سب رقم یعنی اصل اور جیت کی رقم کلب ہی میں جمع کرا دی تا کہ پھر کالج کے کسی اور بورڈنگ ہاؤس کے لیے چندہ لینے کی ضرورت نہ پڑے۔

(۴)

جھوٹ اور چوری کا قاعدہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ لغزشیں کسی سے سرزد ہو جائیں، اس کے بعد ان کی پردہ پوشی کے لیے لاکھوں جھوٹ تراشے جاتے ہیں اور سینکڑوں مزید چوریاں کرنی پڑتی ہیں۔ اگر پہلے ہی دن ہم نے ذرا جرأت سے کام لے کر بیگم سے کہہ دیا ہوتا کہ چاہے تم جان سے مار ڈالو گھر تاش کھیلنے کا ہم کو شوق ہے اور کلب میں اس شوق کو پورا کرنے کے لیے جانے پر ہم مجبور ہیں تو اسی دن اور اسی وقت جو کچھ ہونے والا تھا ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ وہ آسانی سے اپنے شوہر کا قمار باز ہونا برداشت نہ کرتیں۔ کچھ قسمت کو روتیں، کچھ اپنے اوپر مظلومیت طاری کرتیں۔ ایک آدھ ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ ممکن تھا کہ تھا بھوک ہڑتال تک نوبت پہنچ جاتی۔ پھولی سوجھی رہتیں، مگر آخر رفتہ رفتہ اپنے قرینہ پر آجاتیں اور ایک بہادرانہ سچائی ہمیشہ کے جھوٹ اور ایک مسلسل چوری سے بچا دیتی۔ مگر بہت سی باتیں محض لکھی اور کہی جاسکتی ہیں عمل میں کبھی نہیں آسکتیں۔ سنا ہے کہ بہت سے شوہر ایسے بھی پائے گئے ہیں جنھوں نے اس قسم کے خوفناک سچ بولے ہیں اور ان تمام کیفیات کا مقابلہ کر گذرے ہیں جن کے تصور ہی سے ایک نارمل قسم کے شوہر کو کپکپی شروع ہو جائے۔ بہرصورت ہم کو اعتراف ہے کہ نہ تو ہم یہ سچ بول سکے اور نہ آئندہ کے لیے اپنے میں یہ ہمت پاتے ہیں۔ کہیے تو آگ کے دریا کو ڈوب کر پار جائیں، توپ کے مقابلہ پر ڈٹ جائیں، جانبازی کے کسی اور معرکے میں بھیج دیجئے۔ کیا مجال جو پائے ثبات میں خفیف سی لغزش بھی پیدا ہو۔ مگر بیوی سے سچ بولنے کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے ہم ذرا مجبور ہیں۔ جانتے ہیں کہ چور ہو کر رہ گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ احساس ہے کہ یہ کمزوریاں اور بھی بزدل بنا رہی ہیں۔ ضمیر غریب نے برابر ملامت کی۔ پہلے اس کی آواز برابر سنتے تھے پھر دوسرے تیسرے سننے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز ہفتہ وار آنے لگی اور اب تو معلوم نہیں بے چارہ زندہ بھی ہے یا اللہ کو پیارا ہوا، مگر بیگم کو اب تک یہ اطلاع نہیں ہے کہ ان کا یہ وفا شعار شوہر کس قدر دروغ باف اور کیسا خطرناک چور ہو کر رہ گیا ہے۔ کبھی دفتر میں کسی بڑے افسر کے معائنہ کی وجہ سے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔ کبھی کسی حاکم کی لڑکی کے انتظامات میں مصروفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی دورے پر جانا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ کلب جانے کے لیے تو کسی نہ کسی طرح وقت نکالنا پڑتا ہے۔ البتہ اب بیگم کو یہ فکر ضرور ہے کہ اس مصروفیت میں کہیں صحت پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑ جائے۔ سمجھے یہ تھے کہ کچھ دن تک وہ دیر سویر کے متعلق پوچھ گچھ کا سلسلہ قائم رکھیں گی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ عادی ہو جائیں گی اور غالباً یہ احتساب اٹھ جائے گا مگر اللہ ری وضع داری کہ یہ جواب ہمیشہ طلب کیا جاتا ہے کہ ''اور آج کیا ہو گیا تھا کہ آدھی رات ہو گئی۔'' اس میں شک نہیں کہ بہانہ بازیوں نے اچھا خاصا افسانہ نگار بنا دیا ہے کہ جہاں انہوں نے یہ سوال کیا فوراً ایک فی البدیہہ غیر مطبوعہ افسانہ نذر کر دیا جاتا ہے۔

کل رات ہی کا قصہ ہے کہ کلب میں رمی کی محفل جو جمی تو ''بس یہ آخری رمی ہے۔ اور اس رمی کے بعد کھیل قطعی طور پر ختم ہو جائے گا۔'' کہہ کہہ کر یاروں نے ساڑھے بارہ بجا دیئے۔ اب جو گھر پہنچے ہیں تو سرہانے ٹیبل لیمپ روشن تھا اور کتب بینی ہو رہی تھی۔ ہمارے پہنچتے ہی ہماری سماعت پر بجلی گرائی گئی۔

''ماشاءاللہ، ذرا گھڑی دیکھ لیجئے۔''

ہم نے شیروانی ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اپنی پڑی ہے۔ یہاں زندگی سے عاجز آ چکے ہیں۔ جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔“

لاکھ کچھ سہی پھر بھی آخر بیوی ہیں، فوراً ہمدردی شروع کر دی۔ ”کولہو کے بیل کی طرح جتے ہی تو رہتے ہیں کام میں، میں تو دو مہینے بعد سے یہی نقشہ دیکھ رہی ہوں کہ گھر پر صورت ہی دکھائی نہیں دیتی۔ روز کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے۔ آخر آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟“

ہم نے خستہ آواز میں کہا۔ ”آدمی تھوڑے سمجھتے ہیں یہ لوگ، جانور سمجھ رکھا ہے جانور۔ دفتر کا کام ختم کر کے آ ہی رہے تھے کہ ڈائریکٹر صاحب کا تار ملا۔ گھر آنے کے بجائے اسٹیشن جانا پڑا۔ گاڑی دو گھنٹے لیٹ، وہیں جیسی بھی ملی چائے پی لی اور مرتے رہے پلیٹ فارم پر۔ خدا خدا کر کے گاڑی آئی تو اب گویا ان حضرت کی اردلی میں آ گئے۔ ان کے ساتھ دفتر آئے۔ بڑی دیر فائلوں سے سر کھپاتے رہے اس کے بعد ان کے ساتھ جانا پڑا سنیما، انگریزی فلموں سے یونہی الجھن رہتی ہے۔ آدھی رات تک وہاں آنکھیں پھوڑیں۔“

بیگم نے کہا۔ ”تو ان ڈائریکٹر صاحب نے تو اچھا گھر دیکھ لیا ہے۔ ابھی چھ سات دن ہوئے جب آ چکے تھے۔“

دروغ گورا حافظہ نہ باشد۔ واقعی ایک ہفتہ ادھر یہی بہانہ کر چکے تھے۔ بات یہ ہے کہ جانا تو ٹھہر روز کا اور بہانے ٹھہرے محدود، ہر روز نیا مضمون مشکل ہی سے ملتا ہے مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

ہم نے فوراً کہا۔ ”کون وہ ہاں۔ مگر وہ تو دوسرے ڈائریکٹر تھے۔ یہی تو مصیبت ہے کہ اس محکمہ میں، محکوم تو ہم چند ہی ہیں، باقی حکام کا کوئی شمار ہی نہیں۔ تین

چار تو ڈائریکٹر ہی ہیں۔ ایک معائنہ کرنے آتا ہے تو اس کی ضد میں دوسرا ضرور آتا ہے۔ پچھلے ہفتے منجھلے ڈائریکٹر صاحب آئے تھے۔“

بیگم نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا اب ڈائریکٹر بھی بڑے، منجھلے، سنجھلے اور چھوٹے ہونے لگے۔“

ہم نے برجستگی سے کہا۔ ”آپ تو صرف یہی کہہ رہی ہیں۔ ہمارے یہاں تو سگے اور سوتیلے تک ہوتے ہیں پھر ایک قسم ڈائریکٹروں کی اور بھی ہے یعنی چچا زاد ڈائریکٹر۔ خالہ زاد ڈائریکٹر۔“

بیگم نے مذاق سمجھ کر کہا۔ ”اچھا اب رہنے دیجئے چلے ہیں بنانے۔“

ہم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یقین تو مانا کیجئے۔ بات یہ ہے کہ خود ہمارے محکمہ کے چار ڈائریکٹر ہیں، وہ تو حسب مراتب بڑے، منجھلے، سنجھلے اور چھوٹے ڈائریکٹر کہلاتے ہیں۔ اب چونکہ جنگلات کے محکمہ کا بھی تھوڑا بہت تعلق اس محکمہ سے ہے، لہٰذا نہر کے رشتہ سے اس ڈائریکٹر کو خالہ زاد ڈائریکٹر کہا جاتا ہے۔ انکم ٹیکس والے ڈائریکٹر کو ہم لوگ سوتیلا ڈائریکٹر کہتے ہیں مختصر یہ کہ ؎

آسمان گردش میں ہیں ہم کو مٹانے کے لیے
چکیاں تو چل رہی ہیں ایک دانے کے لیے

بیگم نے غالباً ہم پر ترس کھا کر یا خود الجھ کر کہا۔ ”اچھا خیر ہوں گے موئے ڈائریکٹر، کھانا منگاؤں یا اس کا ارادہ بھی نہیں ہے۔“

تاش کے کھیل میں اور خصوصاً کلب میں جو کھیل ہو، وہاں منہ برابر چلتا رہتا ہے کہ دماغ پر معدہ حاوی ہونے نہ پائے۔ یہاں کھانے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنی جان سے بیزار ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو بس سو جانے دیجئے۔ بالکل خاموش لیٹ کر سونے کی نیت کو دل چاہ رہا ہے۔“ خاموش لیٹنے

کی واقعی ضرورت تھی تا کہ کل کے متعلق بہانہ تصنیف کر سکیں۔ اور پھر سو بھی سکیں۔

بیگم نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ''یہی تو میں دیکھ رہی ہوں کہ محنت تو ہے۔ ایسی صحت ہمیشہ سے لاجواب ہے۔ دن بھر کے تھکے ہارے اور منہ لپیٹ کر پڑ رہے۔''

اس کو کہتے ہیں الہام تھکے ہوئے تو تھے ہی مگر واقعی آج ہارے بھی خوب تھے۔ کلب میں جتنا روپیہ جمع تھا وہ سب اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی یعنی اب کل صرف کلب ہی نہیں جانا تھا بلکہ روپے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں کوئی تیر بہدف ترکیب سوچنا تھی مگر بیگم صاحب کی ہمدردیاں کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ آخر ہم نے نہایت مسکینی کے ساتھ کہا۔ ''میں خود عاجز آچکا ہوں۔ اس ملازمت سے اس قدر محنت، دماغی الجھنیں، نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا ہوش، پھر بھی بہت سی پریشانیاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو میں آپ سے بیان کرنا نہیں چاہتا۔''

بیگم نے ہمارے مقصد کے عین مطابق تڑپ کر کہا۔ ''مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ آج کل آپ کچھ دماغی الجھنوں میں ہیں، نہ گھر کی کسی بات سے کوئی دلچسپی ہے اور کام ہو یا نہ ہو...... مگر ویسے بھی آپ کی طبیعت گھر سے کچھ اچاٹ سی رہتی ہے۔ یہ بات تو آپ نے اب نئی سیکھی ہے کہ مجھ سے بھی اپنی پریشانیاں چھپائیں۔ آخر آپ مجھ سے نہ کہیں گے تو کس سے کہیں گے۔ آج معلوم نہیں کیسے آپ کی زبان سے اتنی بات نکل گئی۔ اب تو میں پوچھ کر رہوں گی کہ آخر قصہ کیا ہے اور آپ کو میری ہی قسم ہے جو مجھ سے کچھ چھپائیں۔''

مطلب تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ مگر ضمیر نے آج پھر مداخلت بیجا شروع کر دی۔ ایک آواز سی آئی کہ او کمبخت دیکھ اس معصوم خاتون کو کہ یہ تیرے لیے کس قدر بے قرار ہو گئی ہے اور تو ہے کہ اس کا دھوکا دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ضمیر کے بہکانے میں آ کر کہنے ہی والے تھے کہ بیگم یہ سب اداکاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم بڑے حضرت وغیرہ

وغیرہ۔ مگر عین وقت پر خیال آیا کہ ہمیشہ کے لیے اعتبار ہو تو اس کا اعتراف جرم کر لو۔ چنانچہ ہم نے ضمیر کو مداخلت بے جا کے سلسلہ میں ڈانٹ ڈپٹ کر نہایت گلوگیر آواز میں بیگم سے کہا۔ ''میں خود پریشان رہ سکتا ہوں مگر مجھ سے یہ ناممکن ہے کہ آپ کو پریشان دیکھوں۔ مرد تو پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے ہی گئے ہیں مگر آپ کا یہ کام نہیں ہے۔''

بیگم نے نہایت محبت سے ہمارا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ اگر پریشان رہیں گے تو کیا آپ کو یقین ہے کہ میں مطمئن اور خوش رہ سکوں گی۔ کبھی نہیں۔ البتہ اگر آپ کی پریشانیاں میری وجہ سے دور ہو سکیں یا کم سے کم ہلکی ہو جائیں تو البتہ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گی۔ اچھا خیر اب میں آپ کو قسم دے چکی ہوں اور اب آپ کو بتانا ہی پڑے گا کہ قصہ کیا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''بات بتانے والی تو نہیں ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ آپ بات بات پر قسم دے دیتی ہیں۔ لہٰذا اب جھک مار کر کہنا ہی پڑے گا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے وہ ڈائریکٹر صاحب جن کا پچھلے مہینے انتقال ہوا ہے کوآپریٹو سوسائٹیز کے مقروض تھے اور ان کے دو ضامنوں میں ایک میں بھی ہوں اور زندہ ہوں لہٰذا قوانین کے مطابق جتنی قسطیں وہ ادا کر کے مرے ہیں ان کے بعد جو روپیہ باقی رہ گیا ہے، اس کا ذمہ دار میں اور دوسرے ضامن صاحب ہیں۔ اس طرح میرے حصے میں ایک ہزار روپیہ آتا ہے جو مجھے دو دو سو روپے کی پانچ قسطوں میں ادا کرنا چاہیے۔''

بیگم نے نہایت فیاضی کے ساتھ کہا۔ ''تو اتنی سی بات کے لیے آپ اپنے کو الجھنوں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ آخر بنک میں جو روپیہ میرے نام سے جمع ہے۔ وہ کس دن کے لیے ہے۔ بلکہ میں تو یہی کہتی ہوں کہ قسطوں وسطوں کا جھگڑا بھی فضول ہے۔ پورا ایک ہزار نکال کر دے دیجئے۔ میں اس روپیہ سے زیادہ اس بات سے خوش

ہوں گی کہ جو روپیہ جمع ہے اس کا ایک حصہ آپ کے کام آسکا۔"

ہم نے منہ مانگی مراد پانے کے بعد کہا۔ "روپیہ کیسے دے دیں، ابھی تو ہم کو لڑنا ہے کہ آخر یہ روپیہ ان کے اعزہ سے کیوں نہ وصول کیا جائے۔ سنا ہے کہ ان کا کوئی مکان بھی ان کے وطن میں ہے جو اب ان کے لڑکے کو ملا ہے۔ اصل میں تو اس قرض کا بار اسی مکان پر ہونا چاہیے۔ اب اس کام کے لیے ضرورت ہے کہ وکیل کیا جائے اور سوا سو روپیہ فوراً خرچ کیا جائے۔ امید ہے کہ ہمارا عذر مان لیا جائے گا۔"

بیگم نے ہمارے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں تو جو ترکیب ہو سکے وہ کیجیے نا۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کل ہی مجھ سے روپیہ لے کر وکیل کو دیجیے۔ اگر آپ کا عذر سن لیا گیا تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ جہاں ایک ہزار وہاں بارہ سو سہی۔ مگر خدا کے لیے آپ اپنے کو اس طرح ستی تو نہ کیجیے۔"

ہم نے زبان سے تو کسرِ نفسی کے مارے ہاں ہوں کہہ کر بات ٹال دی۔ مگر دل اس قدر خوش تھا کہ کیا عرض کریں۔ سوڈیڑھ سو روپیہ تو گویا فوراً مل رہا تھا۔ اگر اس میں برکت ہوئی تو خیر ورنہ آئندہ کے لیے ایک ہزار روپیہ کا اور بھی سامان ہو گیا۔ اگر ہم بیگم سے یہ کہتے کہ ہم کو تاش کھیلنے اور احباب میں اڑانے کے لیے روپیہ درکار ہے تو بھلا وہ اتنی بڑی رقم اپنے روپیہ میں سے دے سکتی تھیں جو ان کے نام سے جمع ہے۔ توبہ کیجیے، مگر یہ ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آ گیا۔ دل کو ایسا اطمینان ہو گیا کہ گویا کلب میں تو خیر پتوں نے ساتھ نہ دیا۔ مگر گھر آ کر بازی جیت لی۔ اڑی ہوئی نیند واپس آ گئی۔ بے فکری نے تھپکنا شروع کیا۔ اور آخر تھوڑی دیر میں ہم کو پتہ نہ تھا کہ ہم کیا ہوئے۔

(۵)

کلب کے ممبروں میں ایک ممبرانی صاحبہ بھی تھیں۔ شیلا۔ لیڈی ڈاکٹر تھیں اور اس وہم میں بھی مبتلا تھیں۔ کہ دنیا میں جتنے مرد ہیں ان کو قدرت نے اس لیے تخلیق کیا ہے کہ وہ آپ کے مریض بن کر رہیں ولایت میں رہنے کا اثر یہ تھا کہ مردوں میں اپنے کو اجنبی محسوس نہ کرتی تھیں۔ البتہ ہم لوگوں کی زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی اور اس سلسلہ میں ہم سب مل کر کورس میں فیاض کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اور کوسا کرتے تھے جن کی عنایت سے ڈاکٹر شیلا ہمارے کلب کی ممبر بنی تھیں۔ ہمارے کلب کا قاعدہ یہ ہے کہ کسی نئے ممبر کا داخلہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کم سے کم تین ممبر اس کی سفارش کریں۔ چنانچہ فیاض صاحب تو ہیں ہی ابلیس لعین کے پرسنل اسسٹنٹ، آپ نے نہ جانے کہاں سے ڈاکٹر شیلا کو دریافت کیا۔ اور اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں ہم سب پر رعب جمانے کے لیے ان کو اپنے ہمراہ اپنی مہمان کے طور پر کلب میں لانا شروع کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہم لوگ ذرا آپ سے مرعوب ہو جائیں کہ افوہ یہ تو کیوپڈ کا کوئی قریبی عزیز ہے جس نے ایسی لاجواب ہرنی کا شکار کیا ہے۔ حالانکہ وہ لاجواب تو کیا ہوتیں البتہ آدمی کا بچہ ضرور تھیں۔ رفتہ رفتہ ہم سب سے بھی ان کے بے تکلفی ہو گئی اور باوجود ہماری سخت مخالفت کے فیاض نے رمیش اور اخلاق کے ووٹ حاصل کر کے ان کو ممبر بنوا ہی دیا ہم نے ان سب سے صاف کہہ دیا۔ کہ اب ہم تمام آدم زاد اس بنتِ حوا کی وجہ سے کلب کی اس جنت سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خیر کلب سے تو ہم لوگ

نہ نکل سکے مگر کلب کو ان کی صاحبزادی نے جہنم ضرور بنا دیا۔ ان کی موجودگی میں کوئی بے تکلف نہیں ہو سکتا تھا۔ محتاط قسم کی بے تکلفی بھی کوئی بے تکلفی ہے۔ وہ بے چاری تو لاکھ چاہتی تھیں کہ ہم سب نہایت بے باک ہو جائیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مباحث چھیڑا کرتی تھیں کہ ہم اپنی احتیاط کے دائرے سے باہر آ جائیں۔ مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ہم کو خصوصیت کے ساتھ ان سے کچھ الجھن سی تھی۔ ان سے کترانا، ان سے دامن بچانا، ان سے آنکھ چرانا ہماری ایک بے ساختہ ادا بن چکی تھی مگر وہ تھیں کہ ہر طرف سے گھیرے رہتی تھیں۔ رمی کی ٹیبل پر بھی آنے لگیں اور ہمارے ساتھ باقاعدہ رمی کھیلنا شروع کر دی، مگر اس کے باوجود غالباً ان کو خود معلوم تھا کہ ان کی دال گلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مگر اس علم کے باوجود مطمئن تھیں کہ یہ سرکشی ہی ایک دن ان کے آستان پر سجدہ ریز نظر آئے گی۔ مسلسل چھیڑ چھاڑ، بے بات کی بات پر اظہارِ خصوصیت۔ خیر باقی ممبر تو اس میں کوئی مضائقہ بھی نہ سمجھتے تھے، مگر ہمارا اصول ذرا مختلف سا ہے۔ عورت کی نسائیت میں خودداری اور حد تک پندارِ نسائیت وہ چیز ہے جو کشش پیدا کرتی ہے۔ اگر عورت خود گریز کے بجائے تعاقب شروع کر دے تو مرد کی خواش مذاقی کا فرض ہے کہ وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ چنانچہ ہم اپنے نزدیک سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے اور ہمارا یہ اجتناب ان کو اور بھی مشتعل کر رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ وہ جذبات کی رو میں اس قدر بہک چکی تھیں کہ ان کی نگاہوں کو کلب کے ہر ممبر نے پڑھا تھا۔ لوگوں میں یہ چرچا تھا اور ان کو خدا کے فضل سے یہ اطلاع بھی تھی کہ چرچا ہو رہا ہے۔ مگر وہ ٹھہریں تعلیم یافتہ، ولایت زدہ اور پھر گھر کی طرف سے آزاد۔ ماں، باپ خود ان کی رعایا تھے۔ شادی اس لیے کی نہیں تھی کہ پھر یہ فرصت کے رات دن کہاں تھے ۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

لہٰذا ان کو خداوند کریم نے ہماری بداعمالیوں کی منہ بولتی سرکھیلتی سزا کے طور پر

ہم پر نازل کر رکھا تھا۔ وہ مارے دلار کے اس خاکسار کو ’’شوکی‘‘ کہا کرتی تھیں۔ ذرا منہ ٹیڑھا کر کے جوان کے نزدیک نہایت غارت گر بنا دیا کرتا تھا اور آواز میں ذرا کوئل کی سی کوک پیدا کر کے تا کہ ہم بالکل ہی ختم ہو جائیں۔ ٹھگنا سا قد، جھونجھ کے سے پھولے پھولے بال، منہ پر کھڑی ہوئی ناک، بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی۔ ہر لباس میں یکساں نظر آنے والی، اور پھر چہرہ پر جملہ سامانِ آزمائش کی وہ کھیت کہ الامان والحفیظ۔ عطر میں ڈوب کر جب وہ کلب کے ایک فرلانگ اسی طرف ہوتی تھیں تو پتہ چل جاتا تھا کہ ۔

بوئے دل از غبار می آید
شاید آں شہسوار می آید

کبھی ننھی باتیں کر رہی ہیں۔ کبھی ادب اور شعر میں ٹانگ اڑا رہی ہیں۔ کبھی موسیقی سے متنفر کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کبھی بذلہ سنجیاں فرما رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے داؤں صرف اس لیے چلے جاتے تھے کہ کبھی تو ہم متاثر ہوں گے۔ مگر ان کو کون سمجھاتا کہ آپ کی ان ہی تدابیر سے ذوقِ سلیم بیزار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں شاید اس سے بڑھ کر اور کوئی زبردستی نہیں ہو سکتی کہ جس کو دل نہ چاہے وہ دل میں سمانے کی کوشش کرے۔ آخر ایک دن ان کی ان تمام حرکتوں سے عاجز آ کر طے کیے ہوئے بیٹھے تھے کہ آج ڈاکٹر شیلا سے صاف صاف باتیں ہو جائیں گی۔ کھیل ہو رہا تھا کہ یکا یک آپ نے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

’’شوکی، تم میں یہ کیا مرض ہے کہ کھیل کے وقت گونگے ہو جایا کرتے ہو۔‘‘

ہم نے بے پرواہی سے کہا۔ ’’لیڈی ڈاکٹر ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام امراض آپ کی سمجھ میں آ جائیں۔ بہت سے امراض غیر طبی ہوتے ہیں۔‘‘

شیلا نے شرمندہ ہونے کی بجائے اپنے نزدیک حاضر جوابی سے کام لیتے

ہوئے کہا۔ ”طبی ہوں یا غیر طبی مگر ہوتے ہیں وہ امراض ضرور۔“

اخلاق نے بات کاٹ کر کہا۔ ”اور چونکہ وہ امراض ہوتے ہیں لٰہذا یہ طے ہے کہ ان کے لیے چارہ گر کی ضرورت یقیناً ہونا چاہیے۔“

رمیش نے سوچا کہ میں پیچھے کیوں رہ جاؤں پٹ سے بول اٹھا۔ ”اور چارہ گر ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر شیلا گویا سند یافتہ ہیں۔“

شیلا نے ذرا سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”نہیں، واقعی میں یہ دیکھتی ہوں کہ کہیں کھیل شروع ہوا نہیں کہ آپ اتنے بڑے متفکر بن کر بیٹھ جاتے ہیں گویا کوئی بہت بڑا ملکی یا قومی معمہ حل کر رہے ہیں اور ان ہی تاش کے پتوں سے ملک و قوم فیصلہ کرنے والے ہیں۔“

ہم نے جل کر کہا۔ ”تو خیر آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ یہ چاہتی ہیں کہ بظاہر تو میں تاش کھیلتا رہوں ورنہ دراصل میرا فرض یہ ہونا چاہیے کہ آپ کی مصاحبت کرتا رہوں۔“

شیلا نے کہا۔ ”مصاحبت کا سوال نہیں ہے۔ مگر تاشوں کے اس کھیل کو عبادت کا درجہ نہ دو۔“

ہم نے ایک غلط پتہ پھینکتے ہی اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”لاحول ولا قوۃ۔ یہ ہوتا ہے بات کرنے کا نتیجہ کہ غلط پتا پھینک گیا یعنی بنا بنایا سٹ توڑ کر غارت کر دیا۔“

شیلا نے اپنے پتے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں سے اپنی پسند کا پتا لے لو۔“

اخلاق نے ایک دم سے شو کر دیا۔ ”لیجئے جناب میں اس بحث کا دروازہ ہی بند کیے دیتا ہوں۔“

ہم نے تاش کے پتے پٹختے ہوئے کہا۔ ”سارے کھیل کا ناس ہوگیا۔ نل سے میں خود شو کرنے والا تھا۔ اب اٹھارہ میں پھنسا ہوں۔“

رمیش نے ہنس کر کہا۔ ”شکریہ ڈاکٹر شیلا۔ یہ کمبخت لیڈر بنا ہوا تھا۔ اور اگر یہ واقعی شو کر دیتا تو سب ہی ختم تھے۔ اب کم سے کم تھوڑی دیر کھیل تو جاری رہے گا۔“

شیلا نے کہا۔ ”آپ لوگ ان کو اور مشتعل کر رہے ہیں۔ واقعی میں نے باتوں میں لگا کر ان کی جیتی جاتی بازی ہرا دی۔ شوکی، مجھے بڑا افسوس ہے۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ تاش کی میز پر قبرستان کا سناٹا تو نہ رہے۔“

اخلاق نے کہا۔ ”لیجئے وہاں ناز برداریاں شروع ہو گئیں۔ اظہار افسوس ہو رہا ہے۔ معذرت طلب کی جا رہی ہے۔“

رمیش نے اپنا حق ادا کیا۔ ”اور کہا جا رہا ہے کہ ؎

ہم کو دعائیں دو تمھیں قاتل بنا دیا

شیلا کو بھی ہنسی آ گئی اور باقی لوگ بھی ہنس دیئے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ اب یہاں سے کھسک جائیں۔ چنانچہ ادھر ادھر کے بہانے کر کے وہاں سے ٹل گئے مگر ابھی لان پر ایک تنہا گوشہ تک پہنچے تھے کہ شیلا کی آواز آئی۔

”اب یہاں اکیلے میں کس پر غصہ کرو گے۔ تم کو جتنا غصہ آ رہا ہو وہ سب نہایت شوق سے مجھ پر صرف کر دو مگر خدا کے لیے لڑکیوں کی طرح یہ روٹھنا چھوڑ دو۔“

ہم نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”غصہ تو نہیں البتہ ذرا یکسوئی حاصل کرنے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ دل چاہا کہ ذرا دیر تنہائی میں سکون سے بیٹھ لوں۔“

شیلا نے قریب آ کر کہا۔ ”تعجب ہے کہ تم کو تنہائی میں سکون حاصل ہوتا ہے۔ میرا تو دم الٹ جائے۔ میں دراصل اپنی تنہائیوں سے گھبرا کر انجمن میں آئی ہوں۔“

ہم نے کہا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا واسطہ پڑا ہے تنہائی سے لٰہذا آپ کو

جستجو رہتی ہے انجمن کی اور یہاں ہر وقت انجمن سے اور چہل پہل سے اکتا کر تنہائیوں کی تلاش رہتی ہے۔“

شیلا نے گردن کے ایک خاص خم کے ساتھ اپنے لب و لہجہ میں اپنے نزدیک قیامت کی کشش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں یہ دیکھتی ہوں شوکی کہ تم صرف مجھ سے کتراتے ہو اور اس انجمن سے نہیں۔ بلکہ دراصل مجھ سے بیزار ہو کر تنہائی کے گوشے ڈھونڈتے پھرتے ہو۔“

ہم نے حیران ہو کر کہا۔ ”ڈاکٹر، میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تم اپنی ستم ظریفی کا نشانہ آخر مجھ غریب کو کیوں بنائے ہوئے ہو۔ تم کو یہ معلوم ہے کہ تمام دوستوں کو یہ جیتا جاگتا لطیفہ ہاتھ آ گیا ہے اس سلسلہ میں کافی چرچے ہو رہے ہیں۔ ابھی رمیش نے جو مصرعہ پڑھا ہے۔ غالباً اس کا مفہوم بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان تمام باتوں پر مجھ سے زیادہ تم کو خیال کرنا چاہیے تھا۔“

شیلا نے کہا۔ ”مگر میں نے خیال نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس چرچے میں کوئی بات جھوٹ بھی تو نہیں ہے۔ مجھ کو نہایت سچائی کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں واقعی تم سے دلچسپی لیتی ہوں اور اسی احساس نے تم کو مجھ سے اس قدر محتاط بنا دیا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ تو درست ہے مگر کم سے کم مجھ کو میرا قصور تو معلوم ہونا چاہیے۔“

شیلا نے حیرت سے کہا۔ ”کیا مطلب؟ قصور کیا۔“

ہم نے کہا۔ ”یعنی وہ کون سا قصور ہے جس کی سزا کے طور پر آپ مجھ سے دلچسپی لے رہی ہیں۔ میں نے یہ معمہ پہلے خود حل کرنے کی کوشش کی۔ بار بار آئینہ اٹھایا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اپنی عام تندرستی کا جائزہ لیا کسی نتیجہ پر نہ پہنچا۔ اپنی ایک ایک ادا کو پرکھا۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔“

شیلا نے اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”شوکی تم اس قدر بھولے نہ بنو۔ ان باتوں کا جواب نہ میں دے سکتی ہوں نہ میرے جواب سے تم مطمئن ہو سکتے ہو۔ البتہ یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ اب تک تو خیر میں انتہائی ضبط سے کام لے رہی ہوں۔ لیکن تمھاری یہ صبر آزمائیاں کہیں مجھ کو واقعی تماشا بنا کر نہ رکھ دیں۔“

ہم نے کہا۔ ”گویا اب صرف میرے لیے یہ چارہ رہ گیا ہے کہ میں کلب سے مستعفی ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لوں تاکہ میں اس مستقل الجھن سے اور آپ اس مسلسل ستم ظریفی سے باز تو رہ سکیں۔“

شیلا نے گویا اپنے اوپر یاس و حرماں کی تمام ممکن کیفیات طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے کچھ نہیں کہتی اور اگر تم میری وجہ سے کلب کو چھوڑنے کا ارادہ کر رہے ہو تو کل سے تم مجھ کو کلب میں نہ دیکھو گے۔ مگر یاد رکھنا شوکی اگر میں سچی ہوں تو آج کے بعد سے تم کو بھی اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوگا۔“

یہ کہہ کر شیلا نے اپنی گردن جھکا لی۔ غالباً مطلب یہ ہوگا کہ ہم متاثر ہو کر ڈرامائی انداز سے پہلے خاموش رہیں پھر دیوانہ وار آگے بڑھیں۔ دوزانو ہو کر اس کا دامن تھام لیں اور اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہہ دیں کہ ”اے مجسمۂ حسن و رعنائی۔ تو نے اپنے دل کی مراد پائی، تیرے قدموں میں ہے تیرا سودائی۔“ اس ڈرامائی تصور کے آتے ہی ہم کو ہنسی آ گئی۔ شیلا نے پہلے تو بھونچکا ہو کر ہماری ہنسی کو دیکھا پھر اس کو اس وحشت پر واقعی غصہ آ گیا۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ ہم کیوں ہنسے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھی کہ اس کے احساسات کا نہایت بدتمیزی کے ساتھ مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کو اپنی نسائی خودداری کو گہری نیند سے جگانا ہی پڑا اور یکا یک اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ ”تم وحشی درندے ہو۔ پتھر ہو۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اس پتھر سے سر پھوڑا۔“

اس کی آنکھوں میں دو قطرے مرتعش تھے۔ اس کا سارا جسم رعشہ میں مبتلا تھا اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ ہم نے گھبرا کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ معاف کیجئے گا۔ آپ زیادہ بے تکلفی فرما رہی ہیں۔''

شیلا نے سارے جسم سے کانپتے ہوئے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا۔ ''شٹ اپ'' اور برق کی طرح کوند کر پیر پٹختی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ شیلا ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہوگی کہ درختوں کی اوٹ سے ایک ایک کر کے تمام شیاطین ہمارے سامنے آ گئے، مگر نہ کسی کے چہرے پر ہنسی تھی نہ کوئی اور غیر سنجیدگی کی علامت۔ اخلاق نے آتے ہی کہا۔ ''یہ آخر آپ کی کیا حرکت تھی۔''

رمیش نے گویا شیلا کی طرف سے برا مان کر کہا۔ ''آپ انسانیت کے ساتھ بھی اس کو سمجھا سکتے تھے۔ بجائے اس کے کہ اس طرح اس کی توہین کی ہے۔''

فیاض نے بڑے مدبرانہ انداز سے کہا۔ ''معلوم نہیں آپ کو کس دن محسوس ہوگا کہ آپ کی عمر اس غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری کی نہیں ہے۔ معلوم نہیں یہ خامکاریاں کب تک زیب دیتی رہیں گی۔''

ہم نے اس ہر طرف کے حملہ سے گھبرا کر کہا۔ ''بھئی میری بھی سنو گے یا بس مجھ کو ہی برا بھلا کہے جاؤ گے۔''

اخلاق نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ ''ہم لوگ سب سن چکے ہیں اور تمہارے اس نفرت انگیز طرزِ عمل پر اس لیے شرمندہ ہیں کہ تم ہم میں سے ایک ہو تم کو چاہیے کہ شیلا سے معافی مانگو اور جس قدر اس کا دل دکھایا ہے اس کی تلافی کرو۔ اس کے بعد اگر تم متوجہ ہونا نہیں چاہتے تو اس کی ہزار خوبصورت ترکیبیں ہیں۔''

(۲)

اگر نئی روشنی کے تعلیم یافتہ انسان کی حیثیت سے غور کیجئے تو کلب جانا اور وہاں آدھی آدھی رات تک تاش کھیلنا اور وہ بھی روپیہ کی ہار جیت کے ساتھ۔ بظاہر کوئی جرم نہیں ہے۔ بلکہ نئی روشنی نے تو اس سے بھی زیادہ رعایتیں دے رکھی ہیں۔ مثلاً شراب تک میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مگر یہاں غور کرنا ہے بیگم صاحبہ کے نقطۂ نظر سے جو ہمارے کلب اور اس کے تمام مشاغل سے بے خبر تھیں اور ہم مسلسل چوریاں کر رہے تھے۔ یہ غالباً ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں مگر بار بار کہنے کو دل چاہتا ہے کہ چور آدمی خود کبھی نہیں بنتا بلکہ بنا دیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کو اس کی ضرورت کی چیزیں کھلم کھلا رزروشن میں بغیر کسی روک ٹوک کے حاصل ہوتی رہیں تو اس کو یقیناً چور بننے کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔ چور تو وہ مجبوری کے درجہ پر بنتا ہے۔ اگر بیگم صاحبہ کی طرف سے ہم کو یقین ہوتا کہ وہ کلب کی ممبری اور اس قمار بازی کو جائز رکھیں گی اور ہماری ان دلچسپیوں میں برابر کی شریک رہ سکیں گی تو غالباً ہم کو کتے نے نہیں کاٹا کہ تفریحاً چور بن کر رہتے کہ ان کی افتادِ طبیعت کیا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہم سعادت مندی کے ساتھ مقررہ وقت پر دفتر جائیں اور دفتر سے واپسی پر بس ان کی اردلی میں رہیں۔ ہماری دلچسپی کے بہت سے سامان وہ بے چاری خود مہیا کرتی رہتی تھیں۔ مثلاً کیرم بورڈ منگا لیا تھا۔ شطرنج تھی، بیڈمنٹن تھا۔ گویا ان کے نزدیک ہم یہ گڑیاں ان کے ساتھ کھیل کر مطمئن رہ سکتے تھے اور ایک انسان کے لیے بس اتنی ہی دلچسپیاں کافی ہوسکتی تھیں۔

اب ان کو کون سمجھاتا کہ شیر کبھی گھاس نہیں کھاتا۔ ایک آدھ مرتبہ اپنے ایک آدھ عزیز کا تذکرہ کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ چکی تھیں کہ ”توبہ ہے عظیم بھائی تو پیسے لگا کر تاش کھیلتے ہیں۔ اور مجھے جواریوں سے ایسی نفرت ہے کہ وہ اپنے بھائی پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔“

ہم نے بھولے پن کے ساتھ کہا۔ ”اگر میں داؤں لگا کر تاش کھیلنے لگوں تو۔“

محبت سے منہ چڑھا کر فرمایا۔ ”خدا نہ کرے۔ مگر آپ نہیں کھیل سکتے ایک تو اتنی فرصت ہی نہیں، دوسرے اللہ نہ کرے کوئی آپ جواری ہیں؟“

اب بتایئے کہ ایسی خوش اعتقاد بیوی سے چوری نہ کی جائے تو کیا کیا جائے۔ فیاض کا اصول دوسرا تھا۔ اول تو وہ بیوی کو اس کا حق دار ہی نہ سمجھتا تھا کہ وہ یہ احتساب کر سکے۔ دوسرے اس کا نظریہ کچھ اور تھا وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ جب کوئی جرم کرنا ہو تو اس سے بڑے جرم کی اطلاع بیوی کو پہنچاؤ تاکہ وہ تم کو بہت ہی بڑا مجرم سمجھ سکے اور پھر رفتہ رفتہ اس کو یہ اطلاع ہو سکے کہ نہیں یہ خبر غلط ہے یعنی یہ قاتل نہیں ہیں۔ صرف ڈاکو ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ قاتل کے مقابلہ میں ڈاکو ہونا پسند کر کے خدا کا شکر ادا کریں گی کہ ان کا میاں محض ڈاکو نکلا اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت وہ اپنی آزمودہ ترکیب یہ سمجھایا کرتا تھا کہ میاں مجھ ہی کو دیکھو، شروع شروع میں میری گھر والی کو بھی میرے ان مشاغل سے بہت اختلاف تھا۔ بڑے ہاتھ پیر مارے۔ بھوک ہڑتال کی، منہ پھولایا، ٹھنڈی سانسیں بھریں، نیند ہڑتال کی، آنسو بہائے۔ پھر اس عدم تشدد کے بعد تشدد پسندی شروع کر دی۔ یعنی میکے جانے کی دھمکیاں، بات بات پر لڑنے کی کوشش کی۔ مگر آخر کار ہم کو ایک ترکیب سوجھ گئی۔ دراصل ان کو فکر یہ تھی کہ رات کو ایک ایک، دو دو بجے تک غائب کہاں رہتے ہیں۔ ہم نے کئی مرتبہ سمجھایا کلب جاتے ہیں۔ تاش کھیلتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے مگر وہ اسی معصوم مشغلہ کے خلاف تھیں۔ آخر اپنے ایک دوست کی مدد سے ان کو یہ خبر پہنچا دی گئی کہ نہ تاش ہیں نہ کلب، بلکہ وہاں تو اور ہی کچھ ہو رہا ہے، ایک دوسرا گھر بسایا جا رہا ہے۔

بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔ یہ کیا غضب ہو رہا ہے۔ اب جو ہم گھر پر آئے ہیں تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ زبردستی کی جگہ مظلومیت نظر آئی۔ ہمیشہ گھر اس طرح پہنچتے تھے کہ گھر میں قدم رکھا اور بیوی تاک میں بیٹھی رہتی تھیں کہ آج تو آنے دو، چنانچہ ہر روز ایک نئی قسم کی جھاڑ دی جاتی تھی۔ دو گھنٹہ تک وہ فصیح و بلیغ تقریر ہوتی تھی کہ زندگی سے عاجز آجاتے تھے۔ پھر اس تقریر میں آنسو بھی ہوتے تھے، اپنے لیے بد دعائیں بھی ہوتی تھیں۔ ہمارے مستقبل پر بھی نہایت تاریک روشنی ڈالی جاتی تھی۔ غیرت دلائی جاتی تھی، عبرت کے نئے نئے نقشے کھینچے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ دماغ کو چرخہ بنا کر رکھ دیا جاتا تھا اور ہم کو روز یہی لوریاں سن کر سونا پڑتا تھا مگر ہم بھی بڑے وضع دار تھے اور ادھر وہ بے انتہا مستقل مزاج یہاں روز دو بجے کے قریب گھر پہنچنا اور وہاں روز فوجداری کی قسم کی فہمائش۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اس کے قائل تھے کہ ؎

تم اپنی خو نہ چھوڑو گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

شروع شروع میں ان کو سمجھایا کہ دیکھو یہ بڑی گنوار پن کی بات ہے کہ رات کو دیر میں گھر پہنچنے پر شوہر کا ٹوکا جائے۔ اس سے کام نہ چلا تو ایک آدھ مرتبہ خوشامد کی، مگر جب اس سے ان کی عادت کے خراب ہونے کا اندیشہ شروع ہوا تو خاموشی اختیار کر لی کہ بھونکنے والے بھونکا ہی کرتے ہیں اور چاند برابر دو بجے رات کو طلوع ہوتا ہے۔ جب خاموشی سے جی گھبرایا تو طے یہ کیا کہ جس وقت وہ ڈانٹا کریں اس وقت ہم گایا کریں، چنانچہ ادھر انھوں نے ڈانٹا اور ادھر ہم نے خیال اڑانا بلمپت اور ورت دونوں

میں بیک وقت شروع کر دیا۔ جوں جوں ان کی آواز تیز ہوتی گئی، ہم پنچم تک پہنچتے گئے تا کہ بہر صورت ان کی آواز ہماری تانوں سے دبی رہے، مگر یہ ترکیب بھی۔ زیادہ دیر چلنے والی نہ تھی آخر سوچتے سوچتے یہ علاج بالمثل والی ترکیب سمجھ میں آئی ہے کہ جس بات سے وہ ناراض ہیں اسی بات سے خوش ہو جائیں۔

فیاض کے اس لکچر سے تنگ آ کر ہم نے آخر ایک ان سے پوچھ ہی لیا۔ تم ہمیشہ علاج بالمثل کی رٹ لگائے رہتے ہو مگر میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ اس کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔"

فیاض نے تجربہ کارانہ انداز سے کہا۔ "پھر وہی بچوں کی سی باتیں کیں۔ ہونہ خامکار۔ سنو، میں نے اس سلسلہ میں بڑا ریاض کیا ہے۔ دھوپ میں یہ بال سفید نہیں ہوئے جو بظاہر کالے نظر آ رہے ہیں، عمر گذاری ہے اس فن کو حاصل کرنے میں۔ اس طریقہ سے بالکل یہ سمجھو کہ جیسے زید پر فالج کا حملہ ہوتا ہے زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ طبیب جواب دے دیتے ہیں۔ اعزہ رو پیٹ کر صبر کر لیتے ہیں۔ دوا چھوڑ دعا شروع کر دی جاتی ہے کہ یکا یک مریض کی حالت سنبھلنے لگتی ہے اور آخر وہ موت کے منہ سے نکل کر زندگی کی طرف واپس آتا ہے۔ ہر چند کہ وہ مفلوج ہے، اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر بے کار ہے، وہ تقریباً زندہ درگور ہے۔ مگر اس کے تمام عزیز خوشیاں مناتے ہیں۔ خدا کی قسم یہ عزیز ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے کہ زید کو مفلوج کر دیا جائے، مگر جب فالج کے بعد ان کی موت کا منظر دکھایا گیا تو فالج ان کو رحمتِ پروردگار نظر آنے لگا اور وہ موت کے مقابلہ میں اس مفلوج زندگی کو اپنی دعاؤں کا نتیجہ سمجھنے لگے۔ چنانچہ بالکل اسی طرح ایک بیوی اپنے شوہر کے چھوٹے عیوب کو اسی وقت معاف کر سکتی ہے جب اس کا ہونہار شوہر کچھ بڑے عیوب اس کے سامنے پیش کرے۔"

ہم نے پھر اپنی زندگی سے عاجز آ کر کہا۔ "وہ تو میں سمجھ گیا۔ مگر پھر تم نے کیا کیا۔"

فیاض نے اپنا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہہ تو چکا ہوں کہ میرے چند دوستوں نے ان کو یہ اطلاع پہنچا دی کہ میں قمار بازی میں نہیں بلکہ عشق بازی میں مبتلا ہوں۔ بس ان کی طبیعت ٹھکانے لگ گئی۔ ساری منہ زوریاں ختم ہو کر رہ گئیں۔ جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ پہلے چنگیز خاں والا اصول برتا جا رہا تھا۔ اور اب مہاتما گاندھی کی پالیسی پر عمل شروع ہوا۔ یعنی سب سے پہلے تو مرن برت رکھا۔ پھر ایک ہفتہ والا برت جس میں صرف پانی پیا جاتا تھا، یا کبھی کبھی چائے۔ ہم کو یہ سب معلوم تھا۔ مگر اس قسم کے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ ذرا مستقل مزاجی اور دانستہ تغافل بلکہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتا رہے۔ چنانچہ ہم بھی گویا اس ستیہ گرہ سے بے خبر رہے۔ آخر ان کے سر پر رومال بندھا ہوا دیکھا۔ قدم ڈگمگائے، ماتا پھڑ پھڑائی۔ مگر دل کو سنبھالا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔ اور اپنے پروگرام پر سختی سے عمل کرتے رہے یعنی روزانہ دو بجے رات کو واپس آتا۔ آخر کہاں تک صبر سے کام لیتیں۔ ایک دن گلے میں باہیں ڈل کر رو ہی تو دیں کہ تم میرا قصور بتا دو۔ آخر میں نے کون سی خطا کی ہے جس کی اتنی بڑی سزا تم مجھ کو دے رہے ہو۔ پہلے تو ہم نے حیرت کا اظہار کیا کہ ماجرا کیا ہے۔ کیسی خطا اور کیسی سزا۔ مگر جب آں محترمہ نے یہ بتایا کہ دیکھئے مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں جانتی ہوں کہ آپ نے اب تک مجھ سے اس لیے چھپایا ہے کہ مجھے تکلیف ہوگی مگر جو تکلیف اب ہونا تھی ہو چکی۔ اگر آپ شادی کر چکے ہیں تو ان کو اسی مکان میں لے آیئے اور اگر اب تک نہیں کی اور یہ طے ہے کہ آپ شادی کرنے والے ہیں تو مجھ کو اپنی ادنیٰ کنیز سمجھ کر اس راز میں بھی شریک کر لیجئے۔ میں خود آپ کی دلہن کو لاؤں گی اور جس قدر بھی خدمت ہو سکے گی کروں گی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ان کے الفاظ کے

بعد ساری اسکیم ختم ہوکر رہ گئی۔ ہم بڑے بدمعاش اور حرفوں سے بنے ہوئے سہی مگر اس وقت آبدیدہ ہوگئے اور اس جنتی اور مقدس خاتون کو واقعی گلے سے لگا کر نہایت پیار سے کہا۔ ”نازو! لیجئے میں ان کا بھی نام لے گیا۔ بھئی ان کا نام ہے نزہت اور میں ان کو نازو کہتا ہوں۔ ہاں میں نے ان کو بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”نازو تم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تمھاری ہی قسم نہ اس قصہ میں کوئی اصلیت ہے نہ میرے آس پاس شادی یا معاشقہ یا اسی قسم کا کوئی اور سوال ہے۔ کلب میں دیر ہوجاتی ہے جس کے باعث تم نہ جانے کیا کیا مفہوم پیدا کرتی رہتی ہو۔“ مگر اب یہ لطیفہ ملاحظہ ہو کہ اس صفائی پر وہ اور بھی مشکوک ہوگئیں کہ اس رقت انگریزی کے باوجود ہم گویا ایسے سخت قسم کے جرائم پیشہ اور ساتھ ہی ساتھ سنگ دل بھی ہیں کہ اب تک ان سے یہ راز چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جس قدر سمجھایا اسی قدر وہ ناسمجھ ہوتی گئیں۔ حالانکہ اس واقعہ سے قبل وہ خطرناک حد تک سمجھ دار تھیں۔ یعنی ہم ان کو سمجھ ناک کہا کرتے تھے۔ بہرحال اس دن کے بعد سے اب وہ برابر کوشش فرماتی رہیں کہ ہم کسی طرح اپنے جرم کا اقبال کرلیں۔ مگر یہاں جرم ہوتو اقبال بھی کیا جائے۔ آخرکار ان کی طرف سے ہمارے پیچھے خفیہ پولیس کی قسم کے لوگ لگائے گئے۔ وہ خود اس تفتیش میں مدتوں سرگردان رہیں مگر نہ ان کو ہماری منگیتر کا ہی پتہ چلا اور نہ ہم کسی ایسی جگہ جاتے ہوئے پائے گئے جہاں جانا ان کے نزدیک ہم کو مجرم ٹھہرا سکتا۔ حد یہ ہے کہ ایک دن تو باقاعدہ تعاقب کیا گیا۔ آگے آگے ہماری فٹن اور پیچھے پیچھے ایک پردہ دار تانگہ۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ یہ تانگہ کس کا ہے اور اس محمل میں کون سی لیلیٰ ہے۔ مگر بظاہر بالکل بیگانہ بنے رہے۔ فٹن کو نہ جانے کہاں کہاں کا چکر دیا تاکہ وہ ذرا خوش ہوتی رہیں کہ آج پکڑلیا۔ مگر آخر میں جب فٹن کلب کے پھاٹک پر جا کر ٹھہری تو تانگہ نہایت مایوسی کے ساتھ واپس ہوگیا۔ اسی طرح متعدد بار ہمارا پیچھا کیا گیا۔ مگر آخری مرتبہ یہ راز اس طرح کھلا کہ رات کو دو بجے ہم کلب سے نکلے تو پھاٹک سے ذرا دور ایک تانگہ موجود تھا۔ اس دن ہم کو خود بھی شبہ ہوا کہ یہ کس کا تانگہ ہے۔ ہم فٹن پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور جب ہم گھر میں داخل ہو رہے تھے تو ساتھ ہی ساتھ بیگم صاحبہ بھی داخل ہوئیں۔ آج ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تازگی بھی تھی۔ اور معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چہرہ پر کسی نے آتش بازی چھوڑ دی ہو۔ پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ آپ اس وقت کہاں سے تشریف لا رہی ہیں۔“

ایک صوفہ پر بے پرواہی سے گر کر کہا۔ ”ذرا کلب گئی تھی تاش کھیلنے۔“

ہم نے اور بھی تعجب سے کہا۔ ”کلب؟ تاش؟ نہیں واقعی آپ کہاں گئیں تھیں۔“

اسی اطمینان سے فرمایا۔ ”ہاں، ہاں کلب گئی تھی۔ ایک چور پکڑنے۔“

اب ہم سمجھے۔ ”اچھا اچھا۔ تو پکڑا آپ نے چور؟“

ذرا افسوس کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ جی ہاں پکڑا تو چور مگر وہ بڑا شاطر تھا ساہوکار نکل گیا۔“

ہم نے کہا۔ ”یعنی کیا مطلب؟“

اب ذرا ایکٹنگ ختم ہو رہی تھی۔ ”اچھا خیر پھر باتیں ہوں گی۔ کپڑے اتار لیجئے۔ سچ کہتی ہوں ایک ہفتہ سے تھکا مارا۔ آج اتفاق سے تانگہ والے نے واپسی میں دیر کردی ورنہ میں تو روز آپ کے ساتھ کلب سے واپس آتی ہوں۔“

معلوم یہ ہوا کہ خود مابدولت روز رات کو کلب کے دروازہ پر جا کر ٹھہر جاتی تھیں اور دو بجے تک برابر کمرے میں جھانک جھانک کر دیکھا جاتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد واپسی پر ساتھ ہی ساتھ واپس آتی تھیں اور کچھ پہلے پہنچ کر اس طرح لیٹ جاتی تھیں گویا سو رہی ہیں۔ اسی رات جب یہ راز ہم پر کھل گیا تو وہ بھی کھل گئیں

کہ میں نے اس اس طرح یہ یہ سنا تھا اور مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ آپ کلب ہرگز نہیں جاتے بلکہ اس طرف تو کلب سے ہمیشہ ہی غیر حاضر رہے ہیں اور کوئی بھاٹیہ صاحب ہیں۔ ان کی لڑکی سے شادی طے ہوچکی ہے۔ اسی چکر میں جناب پھنسے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں نے تفتیش کی اور پتہ چلا کہ آپ پر یہ سب الزام تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ہوا کہ یہ نیک بخت مسٹر بھاٹیہ تک کے یہاں گئی اور وہاں بھی ہر طرح چھان بین کی۔ ان کی لڑکی سے بلا وجہ جلی۔ وہ تو کہیے کہ وہاں یہ نہ کہا کہ تمھارے ساتھ میرے میاں کی شادی ہونے والی ہے، ورنہ اور بھی لینے کے دینے پڑ جاتے۔ تو بھائی میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس دن سے اس طرف سے بیگم صاحبہ کو اطمینان ہوا ہے، وہ اس کلب کی حاضری اور تاش کے کھیل کو دل سے پسند کرتی ہیں۔ بلکہ اب تو اگر کبھی کلب جانا نہ ہو تو پوچھا کرتی ہیں کہ ”طبیعت کیسی ہے۔“ یا اگر کسی دن دو بجے سے پہلے یعنی گیارہ بجے گھر آ گئے تو ان کا دل دھک سے ہو جاتا کہ الٰہی خیر، نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے کہ سرِ شام گھر آ گئے ہیں۔“

ہم نے مسکرا کر کہا۔ ”گیارہ بجے سرِ شام؟“

کہنے لگے۔ ”جی اور کیا۔ بارہ بجے تک ہمارے یہاں چراغ کا وقت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رات دو بجے سے شروع ہوتی ہے، تو صاحبِ من آپ نے دیکھ لیا کہ ایک بڑا جرم جب ان کے سامنے آیا تو یہ چھوٹے جرم ہنر بن گئے۔ وہ دن اور آج کا دن کہ بیگم نے کلب جانے یا تاش کھیلنے کی مخالفت نہیں کی۔“

(۷)

روپیہ کا انتظام تو گویا ہو ہی چکا تھا۔ اللہ خوش رکھے بیوی کو، بنک سے روپیہ نکلوا کر دے دیا تھا اور ہم برابر کلب میں رئیس بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں راجہ نل بھی مہربان رہے، خوب خوب جیتے۔ بلکہ کلب کے اکثر ممبروں کا دیوالیہ گویا ہماری ہی مساعی جمیلہ کے بدولت نکلا۔ اگر چاہتے تو بیوی کا روپیہ واپس کر دیتے مگر برے وقت کے لیے کچھ نہ کچھ جمع ہی رہنا چاہیے۔ کلب کے ہارے ہوئے ممبروں پر خدا کے فضل سے اتنا روپیہ قرض ہو چکا تھا کہ کھیل کے وقت ہم کو اپنے سرمایۂ محفوظ کو چھونے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر وہ ایک چیز ہے نا۔ دل کا چور ہونا۔ اس کمبخت کے بدولت دل کو اطمینان نہ تھا۔ کبھی یہ سوچتے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر شیطان فوراً جواب دیتا کہ یہ انجام بینی بڑھاپے کی علامت ہے۔ کبھی شرافت کا دورہ پڑتا تو دیر تک بیوی کی معصومیت پر غور کیا کرتے۔ مگر پھر شیطان سمجھاتا کہ دیکھو میاں یہی غور و فکر تم کو تباہ کر دے گا۔ یاد رکھو بیوی کبھی معصوم نہیں ہوتی۔ وہ خود اپنا قصہ سناتا کہ میری آنکھوں نے آدم اور حوا کو دیکھا ہے۔ حوا ہی نے آدم سے جنت چھڑائی تھی۔ اب تم بیوی کی وجہ سے اپنی دلچسپیاں چھوڑنا چاہتے ہو۔ اول تو یہ دلچسپیاں اگر تم نے چھوڑ دیں تو اس کا کوئی خوشگوار اثر تمھاری بیوی پر نہیں پڑ سکتا تاوقتیکہ تم ان کو بتا نہ دو کہ تم سے میں چوری کرتا رہا ہوں اور اس اس طرح کلب میں رنگ رلیاں رہی ہیں۔ یوں تو تم سے روپیہ حاصل کر کے یوں گنوایا ہے اور اگر تم نے یہ

بتا دیا تو یاد رکھو کہ ایک مرتبہ بھرم کھو کر پھر کبھی قائم نہ کر سکو گے۔ لٰہذا اس کارخانہ کو تو بس یوں ہی چلنے دو۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ مگر اب واقعی یہ سوال تھا کہ تمھارا تو یہ معمول بن چکا ہے کہ ڈیڑھ دو بجے رات کو گھر واپس آنا، نت نئے جھوٹ بولنا۔ دوسرے دن کے لیے عہد و پیماں کرنا۔ منہ لپیٹ کر پڑے رہنا۔ ظاہر ہے کہ کوئی بیوی بھی اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتی۔ فیاض سے مشورہ لیا تو اس نے اپنی رام کہانی سنا ڈالی مگر ایک بات تھی کہ فیاض کے دلائل تھے مضبوط اور دل میں اترنے والے۔ پھر یہ کہ ہمارے لیے تو اس کا بہترین موقع تھا۔ یعنی شیلا موجود ہی تھیں۔ ایک فرضی محبوبہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ بار بار اس ترکیب پر عمل کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ہچکچا کر رہ گئے۔ آخر ایک روز اپنے استاد فیاض سے مشورہ کیا۔

“ارے بھائی، خدا کے لیے مجھے بھی بتاؤ کہ یہ روز روز کی بہانہ بازیاں اور یہ سدابہار جھوٹ کب تک چلیں گے۔”

فیاض نے مدبرانہ انداز سے کہا۔ “جب تک سچ بولنے کی جرأت پیدا نہ کرو اور بیوی سے صاف صاف نہ کہہ دو کہ میں کلب جاتا ہوں اور کارڈس کھیلتا ہوں۔”

ہم نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ “یہ تو قیامت تک نہیں کہہ سکتا۔”

فیاض نے عجیب سوال کیا۔ “کیوں؟ مار ڈالیں گی تم کو؟ ذبح کر دیں گی؟ مرغا بنا دیں گی؟ آخر کریں گی کیا؟ ان سے آپ آخر کیوں نہیں کہہ سکتے کہ تم کو میری ان تفریحات پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ سوسائٹی نے ان تفریحات کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ نہ تم دراصل کوئی بدمعاشی کرتے ہو، نہ چور ہو، نہ اٹھائی گیرے۔ دل بہلانے کو ذرا تاش کھیل لیتے ہو یہی نا۔ پھر اس کو آپ اتنا بڑا جرم کیوں سمجھ رہے ہیں۔ کہ دم ہی نکلا جاتا ہے۔”

ہم نے بالکل سچ بولتے ہوئے کہا۔ “بھائی میاں۔ تم سمجھتے نہیں ہو۔ نہ جانے کیوں میرا دم نکلتا ہے بیوی سے۔ قصہ دراصل ہے کہ وہ مجھ کو مرعوب کر چکی ہیں۔ ان کی دہشت طاری ہو چکی ہے۔ اب ان کے سامنے جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کی سپاہیانہ ترکیبیں نا بتاؤ، بلکہ تم تو ٹھہرے چھٹے ہوئے چار سو بیس، کوئی ایسی ترکیب بتاؤ جس کو تم تگڑم کہتے ہو، جس میں ہلدی اور پھٹکری وغیرہ کچھ نہیں لگتی اور رنگ چوکھا آیا کرتا ہے۔ آخر تم نے خود اپنے لیے کیسی اچھی ترکیب نکال لی تھی۔”

فیاض نے پھڑک کر کہا۔ “ہاں تو پھر ویسی ہی ترکیب کرو۔ مگر یہ ذرا یونانی طریقہ علاج ہے۔ جس میں دو باتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یعنی مستقل مزاجی اور پرہیز۔ مستقل مزاجی تو یہ ہونا چاہیے کہ خواہ کتنی ہی دیر لگے مگر نتائج کی طرف سے مایوس نہ ہونا اور پرہیز یہ کہ پھر بیوی خواہ کیسی مسکین نظر آئے اس پر کیسا ہی پیار کیوں نہ آئے مگر اس پر یہ راز کبھی ظاہر نہ کرنا تاوقتیکہ وہ خود اس راز کو نہ کھول دے۔ یا یہ راز خود بخود اس پر نہ کھل جائے۔”

ہم نے کہا۔ “جناب حکیم صاحب میں اس یونانی طریقہ علاج کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ اب تو اس مجرمانہ زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔”

فیاض نے واقعی حکیم بنتے ہوئے کہا۔ “پھر وہی مجرمانہ زندگی۔ یار بات یہ ہے کہ تم ذاتی طور پر بھی کچھ گھامڑ واقع ہوئے ہو۔ تمھارے لیے تو ضرورت اس کی ہے کہ پہلے تمھارے ضمیر کو مارا جائے اس کے بعد تم قابل علاج بھی ہو سکتے ہو۔ تم کو دراصل شرافت کی دق ہو گئی ہے۔ یہ مرض قابلِ علاج بھی ہے بشرطیکہ تم لقمان کو حکمت پڑھانے کی کبھی کوشش نہ کرو اور صدق دل سے وعدہ کرو کہ میرے طریقہ علاج میں کبھی ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کرو گے۔”

ہم نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ “میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی مداخلت نہ کروں گا۔”

فیاض نے ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو اب کل ہی سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں مجھے نازو سے بھی مدد لینا پڑے گی۔ کل تمھاری بیگم صاحبہ کو چائے پر میرے یہاں بلایا جائے گا اور وہیں بسم اللہ یا شافی کہہ کر پہلی خوراک ان کو پلائی جائے گی۔ واضح رہے علاج ہوگا آپ کا مگر دوا پینا پڑے گی بھابی جان کو۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ داروئے تلخ دفع مرض کے لیے حکماء کے نزدیک اکثر ضروری ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اس دوا کی تمام کڑواہٹ تو وہ محسوس کریں گی اور فائدہ ہوگا آپ کو۔ اس جدید طریقۂ علاج کو اصلاح طب میں ”دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں“ کہتے ہیں۔“

ہم نے تنگ آ کر کہا۔ ”خدا کے لیے یہ خرافات ختم کرو اور یہ بتاؤ کہ آخر ان سے کہا کیا جائے گا۔“

فیاض نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”خرافات؟ یعنی یہ حکیمانہ باتیں خرافات؟ اوں ہونھ ...... تمھارا علاج نہیں ہو سکتا۔ تم سخت بداعتقاد قسم کے مریض معلوم ہوتے ہو۔“

ہم نے کہا۔ ”اچھا صاحب معاف کر دیجیے اور کم سے کم یہ تو بتا دیجیے کہ آخر ان کو کہا کیا جائے گا؟“

فیاض نے کہا۔ ”ان سے جو کچھ کہا جائے گا وہ تم خود سن لینا۔ ان کو ایسے کمرے میں بٹھایا جائے گا کہ ساتھ والے کمرے میں تم بیٹھ کر سب کچھ سن سکو گے مگر تم کو اپنا دل سخت کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ تم نہ سن سکو یا جو کچھ تمھاری وہ سنیں اس کے بعد ان کا جو حال ہو وہ تم سے برداشت نہ ہو سکے۔ ان تمام باتوں کی طرف سے اطمینان کر لو۔ ہم لوگ اسی لیے کمزور دل لوگوں کو آپریشن تھیٹر میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔“

اب ہم نے بے حد خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائی میں سب کچھ برداشت کر لوں گا۔ مگر مجھے تیار رکھنے کے لیے پہلے سے بتا دو نا کہ ان سے کیا کہا جائے گا؟“

فیاض نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ان کو شیلا کا قصہ بتا دینا بہت کافی ہے۔“

ہم نے ایک دم اچھل کر کہا۔ ”او کمبخت! تو خدا کی قسم بے حد ذہین ہے۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ میں خود تم کو یہ مشورہ دوں گا مگر ......“

فیاض نے انکسار کے ساتھ کہا۔ ”مگر لقمان کو آپ سے حکمت کا درس لینے کی ضرورت نہ پڑی۔ ارے بھئی میں خود حیران ہوں کہ قدرت نے یہ صلاحیت مجھ ہیچمدان میں کیسے پیدا کر دی ہے۔ وہ جس کو چاہے نوازے ...... ہاں تو ان کو یہ بتا دیا جائے گا کہ شیلا سے عشق چھن رہا ہے اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ منگنی کے موقع پر تین سو روپے کی انگوٹھی دی گئی ہے۔“

ہم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ارے رے رے! بالکل چپک کر رہ جائے گی۔ کھٹ سے ذہن میں اترے گی۔ اس لیے کہ حال ہی میں ایک ہزار کے وارے نیارے کر چکا ہوں۔ خود ان کے نام سے بنک میں جمع تھا اور ان ہی سے نکلوایا ہے۔“

فیاض نے سنجیدگی کے ساتھ بڑی واقف کارانہ گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی، جی، وہ مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ میں آپ حضرات کو سونگھ کر بتا سکتا ہوں۔ کہ آج کل کن حالات سے گذر رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ ترکیب نکالی۔ ہاں تو پھر میری بیوی شدید وارفتگی کی اطلاع ان کو دیں گی۔ اور یہ بتا دیں گی کہ گویا تم نے مجھ سے سب کچھ کہا تھا اور میں نے ان سے کہہ کر تاکید کر دی کہ اس کی خبر کسی کو نہ ہو۔ پھر شیلا کی شکل صورت بیان ہوگی۔ شیلا سے تمھاری خط و کتابت، شیلا کے ساتھ تمھارا الہ آباد جانا۔“

ہم نے چونک کر کہا۔ ”او ظالم تجھ کو الہ آباد جانا بھی اسی وقت کے لیے یاد رہ گیا تھا۔“

فیاض نے روانی کے ساتھ کہا۔ ’’بھائی صاحب افسانہ کی کڑیا ملانے کے لیے اس قسم کی تمام جزویات کو میں اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں کہ خدا جانے کب کس بات کی ضرورت پیش آ جائے۔ تو خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اسی قسم کی بہت سی باتیں ان کو بتا کر پھر یہ بھی زور دیا جائے گا کہ ان کا اظہار وہ تم پر نہ کریں۔ اس کے بعد یہ مشورہ ہے کہ اب قسمت پر شا کر رہو۔ کلیجہ پر پتھر رکھ لو۔ جو کچھ گزرے صبر و سکون کے ساتھ ایسے ہوں گے کہ شاید وہ اسی وقت ان تمام مشوروں کی خلاف ورزی شروع کر دیں۔

رونا تو خیر برحق ہے ممکن ہے کہ اختلاجی کیفیت طاری ہو جائے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ میری بیوی کی طرح عقل سے کام نہ لیں اور پہلے ہی دن تم سے جنگ چھڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا یونانی دوا نے بھی فوری اثر دکھایا۔ تم کو تو بہر صورت اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ہی ہے، بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مگر تم برابر انکار کرتے رہنا اور جو واقعہ ہے وہ کہتے رہنا کہ تم کو شیلا سے دلچسپی تک نہیں ہے بلکہ اس قسم کی الجھن ہے، مگر وہ اس کو تمھاری دروغ بانی سمجھیں گی۔ اس کے بعد ان کو کھوج شروع ہوگی۔ ممکن ہے کہ مجھ سے دریافت کریں۔ بظاہر تمھارا راز دار بن کر گویا اس قصہ کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کروں گا۔ اور اس طرح اس قصہ پر پردہ ڈالوں گا کہ ان کو اور بھی یقین ہو جائے گا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو مختلف ذرائع سے ان کو یہی خبر پہنچائی جائے گی۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں ان کو سولہ آنے تمھارے مکار، فریبی، دغاباز ہونے کا یقین ہو جائے گا۔ اور شیلا سے تمھارے مراسم گویا یقینی سمجھ کر وہ تمھاری طرف سے قطعاً مایوس ہو جائیں گی۔ ان کی حالت ایسی ہوگی کہ تم لاکھ سنگ دل سہی مگر تمھارا کلیجہ منہ کو آنے لگے گا۔ اس وقت اگر تم بہکے اور اس بھانڈے کو پھوڑنے کی کوشش کی تو یاد رکھو کہ پھر زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ البتہ اگر مستقل مزاجی سے کام لے کر یہ تمام صورت حال جھیل لے گئے تو آخر میں جب ان کو معلوم ہوگا کہ تم محض کلب کی دلچسپیوں اور تاش وغیر میں الجھے ہوئے ہو، پھر دیکھنا ان کی خوشی اور اس وقت دیکھنا کہ یہی ناگوار باتیں کس طرح گوارا کر لی جاتی ہیں۔‘‘

ہم نے اس طویل اسکیم کو سن کر کہا۔ ’’اچھا بھائی اب خدا کے لیے بخش دو۔ سنتے سنتے کان پک گئے۔ سر چکرانے لگا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہو خطرناک قسم کے آدمی، تمھارے کاٹے کا منتر نہیں ہے۔‘‘

فیاض نے کہا۔ خیر اب میری خوشامد نہ کیجئے۔ بہر حال اب یہ طے ہے کہ صبح آپ کے یہاں دعوت نامہ آئے گا اور سہ پہر کو آپ کی بیگم صاحبہ غریب خانہ پر چائے نوشی کے لیے تشریف لائیں گی۔ آپ ان سے چھپ کر تشریف لا سکتے ہیں تا کہ آپ خود یہ منظر دیکھ لیں۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض۔‘‘

(۸)

فیاض کے یہاں بیگم صاحبہ کے پہنچنے سے کچھ پہلے ہی ہم پہنچ چکے تھے اور ہم کو اس کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا جس کے برابر والے کمرے میں ہماری بیوی پر بجلی گرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ نازو سے ہمارا اور رفو...... زبان پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا...... یہ بیگم صاحبہ کے اسمِ گرامی کا سکڑا ہوا نمونہ ہے۔ رفیعہ نام ہے، مگر سب رفو، رفو کہتے ہیں لہٰذا ہم بھی ان کو یہی کہتے آئے ہیں، تو ہاں، نازو سے ہمارا اور رفو سے فیاض کا پردہ نہ تھا۔ لہٰذا اس تانک جھانک میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ شروع شروع میں کچھ کا ناپردہ دونوں گھروں میں ہوا، مگر پھر اس کو مہمل سمجھ کر اٹھا دیا گیا۔ ہم کو اس کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ بیگم نے نازو سے کہا۔ ''بھائی صاحب سے میرا اسلام کہلوا دو تا کہ ان کو خبر تو ہو جائے کہ میں آ گئی ہوں۔''

ان کو تو پہلے ہی سمجھا بجھا دیا گیا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ لہٰذا انھوں نے بڑی تلخی سے جواب دیا۔ ''آپ کے بھائی صاحب کی خبر مجھ کو ہو تو کہلوا بھی دوں۔ نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ گھر تو ان کے لیے بنایا گیا ہے کہ جب کہیں ٹھکانہ باقی نہیں رہتا تو مجبوراً گھر آ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی تمھارے میاں ہیں کہ گھر والوں کی طرح گھر میں رہتے ہیں۔''

بیگم نے ہمارے ساتھ غائبانہ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی کہاں گھر پر رہتے ہیں۔ اب تو مدتوں سے بے چارے کا یہ حال ہے کہ دفتر چلے گئے اور واپسی ہوئی کوئی دو ڈھائی بجے رات تک۔''

نازو نے بڑی عمدہ ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں...... ٹھیک تو ہے، وہ اب کیسے گھر پر رہ سکتے ہیں...... مگر تو یہ ہے...... خیر کچھ نہیں۔''

بیگم نے حیرت سے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا، بات کیا ہے آخر، کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔''

نازو نے گویا ٹالتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پان کھاؤ گی یا منگاؤں چائے۔''

بیگم نے اپنی ہی کہی۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہی تھیں؟''

نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سچ مچ میرے پیٹ میں بات ہضم نہیں ہوتی۔ فیاض صاحب نے کس سختی سے منع کیا تھا کہ کبھی یہ بات زبان پر نہ آئے۔ میری کمبختی یہ کہ زبان پر آئی بھی تو کس کے سامنے جن سے سب سے زیادہ بات چھپانے کی ضرورت تھی۔''

بیگم نے اور بھی زیادہ اشتیاق کے ساتھ کہا۔ ''آخر بات کیا ہے تم کو تو میری ہی قسم جو مجھ سے کچھ چھپاؤ۔''

نازو نے کہا۔ ''ارے اب تو بتانا ہی پڑے گی ورنہ تم کو بھلا چین کہاں۔ حالانکہ ایسی بات کمبخت اگر نہ سنی جائے تو اچھا ہے۔ خیر تم چائے پیو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بتا دی جائے گی ہر بات۔''

بیگم نے بے صبری کے ساتھ کہا۔ ''تم نے تو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اب یہی جی چاہتا ہے کہ پہلے وہ بات سن لی جائے پھر چائے وائے دیکھی جائے گی۔''

نازو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''واہ ری آپ کی الجھن۔ کہہ تو چکی ہوں کہ سب کچھ بتاؤں گی۔ ایسی بھی کون سی خوش خبری ہے کہ فوراً ہی بتا دی جائے بات۔ چائے منگاتی ہوں اس کے بعد یہ مواقعہ بھی سن لینا۔''

یہ کہہ کر نازو تو ادھر رخصت ہوئیں چائے کے انتظام کے لیے اور یہاں بیگم کی

آنکھوں میں ایک خاص غوروفکر کی چمک پیدا ہوگئی۔ غالبًا وہ نازو کے بتانے سے پہلے خود ہی سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر کچھ سمجھ مین نہ آتا تھا۔ کھوئی کھوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور ادھر ہم دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تماشے کی ابتدا ٹریجڈی سے ہوئی تھی مگر انجام کی کومیڈی معلوم تھی لہٰذا بیگم کے اس نقشہ پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر اس طرح بیٹھی ہوں گی کہ چائے آ گئی اور ناشتہ چن دیا گیا۔ مگر بیگم نے بالکل رسمی طور پر ناشتہ سے دلچسپی لی۔ منہ اٹھائے ہوئے کچھ سوچ رہی تھیں اور ہاتھوں میں جو چیز بھی کسی پلیٹ سے آ جاتی تھی اٹھا کر منہ میں رکھ لیتی تھیں۔ وہ تو کہیے کہ نازو نے ان کو ٹوک ٹوک کر تھوڑا بہت کھلا دیا ورنہ وہ تو اتنا بھی نہ کھاتیں۔ آخر ناشتہ اٹھ جانے کے بعد پھر یہ دونوں اطمینان سے بیٹھیں تو بیگم نے خود ہی تقاضا کیا۔ ”ہاں اب بتاؤ وہ کیا بات تھی۔“

نازو نے پھر تکلف کرتے ہوئے اور گویا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”توبہ اللہ! کوئی بات بھی تو نہیں تھی میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی۔“

بیگم نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”غلط ہے، اب مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ تمھاری ان باتوں میں آنے والی میں نہیں ہوں۔ تم نے وعدہ کیا ہے تو تم کو بتانا پڑے گا۔“

نازو نے کہا۔ ”ارے تم کو خود معلوم ہوگا۔ وہی شیلا کا قصہ۔“

بیگم نے تعجب سے کہا۔ ”شیلا؟ کون شیلا؟“

نارو نے کہا۔ ”وہی کلب میں جو آتی ہے لیڈی ڈاکٹر شیلا، جس سے پچھلے ہفتہ تمھارے میاں نے منگنی کی ہے۔ تم تو ایسا بن رہی ہو جیسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔“

بیگم نے سناٹے میں آتے ہوئے کہا۔ منگنی چلو ہٹو۔ اب چلی ہیں بے چاری مذاق کرنے۔ میرا میاں، ایسا نہیں ہے کہ اس طرح گلی گلی منگنی بیاہ کرتا پھرے۔ سچ بتاؤ آخر یہ قصہ کیا ہے۔“

نازو نے کہا۔ ”تو کیا سچ مچ تم کو کچھ خبر نہیں ہے۔“

بیگم نے کہا۔ ”مجھے خبر ہوتی تو میں تم سے کیوں پوچھتی۔ مگر یہ اڑائی کس نے ہے۔“

نازو نے بتاتے ہوئے کہا۔ ”بس تم اس کو اڑائی خبر سمجھے جاؤ۔ اور وہاں منگنی کے بعد بیاہ ہو جائے۔ سچ پوچھو تو جب فیاض صاحب نے مجھ سے کہا ہے تو مجھے یقین نہ آتا تھا۔ مگر جب روز یہی ذکر کہ آج یہ ہوا کل وہ ہوا۔ آج یوں دونوں الہ آباد گئے۔ کل یہ خط شیلا نے ان کو لکھا۔ پرسوں یوں شیلا روٹھ گئی اور وہ منا رہے تھے اور آخر میں یہ بھی سن لیا کہ لیجئے منگنی ہوگئی دونوں کی۔ اے یہ قصہ تو کوئی چار پانچ مہینے سے چل رہا ہے۔“

بیگم نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوں ہوں، اچھا تو ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ ہے کیا ماجرا۔ میں تو بس یہ سمجھ رہی تھی کہ چار پانچ مہینے سے کام کچھ زیادہ پڑ گیا ہے۔ ترقی جو ملی ہے تو کام میں بھی ترقی ہوگئی ہے۔ آدھی آدھی رات تک اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ وہاں یہ گل کھل رہا ہے۔“

نازو نے بڑے رازدارانہ طریقہ پر کہا۔ ”گل کھل بھی چکا۔ البتہ اس کی خوشبو چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ فیاض صاحب تو ہر وقت کے دیکھنے والے۔ بلکہ شروع میں تو فیاض صاحب سے بھی ہر بات چھپائی گئی مگر وہ ٹھہرے ایک ہی کھوجئے۔ پتہ لگا ہی لیا۔ اب جب پتہ چل گیا تو اس سے ہزاروں قسمیں لی گئیں کہ فی الحال اس بات کو راز میں رکھیں۔“

بیگم نے کہا۔ ”کیا نام بتایا تم نے...... شکنتلا۔“

نازو نے کہا۔ ”شکنتلا نہیں۔ شیلا، ارے بھئی یہاں ایک بیرسٹر ہیں بھارتی

صاحب، ان کی یہ لڑکی ہیں۔ کچھ ہی دن ہوئے ولایت سے ڈاکٹری پڑھ کر آئی ہیں اور زنانہ اسپتال کی انچارج ہے۔ جس کلب میں یہ لوگ جاتے ہیں اسی کی وہ بھی ممبر ہے۔ وہاں ہر وقت کا تو ساتھ، پیدا ہوگئی دونوں کی آپس میں دلچسپی۔ پہلے اس کے چرچے ہوئے پھر دونوں۔ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ کلب میں دونوں جاتے مگر ایک طرف سر جوڑے بیٹھے رہتے آخر کھلے بندوں دونوں لیلیٰ مجنوں بن کر رہنے لگے۔ صورت شکل تو ہے ہی موئی کی اچھی۔ لمبے لمبے سنہری بال، بادام کی سی آنکھیں، نازک نازک سا نقشہ پھر یہ انگریزی پڑھی۔ ڈاکٹری پاس۔ لوگوں کو تمھارے میاں کے ساتھ اس کی دلچسپی خار بن کر کھٹکنے لگی۔ مگر وہ تو جیسے گلے کا ہار ہوگئی تھی۔ سنا ہے کہ اس نے اپنے باپ سے صاف کہہ دیا کہ شادی کروں گی تو شوکی کے ساتھ۔"

بیگم نے کہا۔ "یہ شوکی کون ہیں؟"

نازو نے کہا۔ "ہائے میرے اللہ یہ نہیں معلوم۔ وہ پیار میں شوکی ہی تو کہتی ہیں تمھارے میاں کو۔ ہاں تو انھوں نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ شادی کروں گی تو شوکی سے ورنہ عمر بھر کنواری رہوں گی۔ آخر وہ لوگ بھی راضی ہوگئے۔ سنا ہے کہ تین سو روپے کی صرف انگوٹھی دی ہے منگنی کی تمھارے میاں نے۔"

بیگم نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ یہ قصہ ہے کب کا۔"

نازو نے گویا یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی کوئی پندرہ بیس دن ادھر کی بات ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو میرے حساب سے بھی اتنے ہی دن ہوئے۔"

نازو نے کہا۔ "ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ تم کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے اور اب حساب بھی لگانے لگیں۔"

بیگم نے کہا۔ "نہیں مجھے خبر تو کچھ بھی نہیں ہے مگر پندرہ بیس دن ادھر مجھ سے نہ جانے کیا بہانے کر کے ایک ہزار روپیہ لیا گیا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے مجھ ہی سے روپیہ لیا جارہا ہے۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ایسا بھی سرکاری کام کیا کہ روز ڈھائی بجے رات کو فرصت ملتی ہے۔ دنیا کے کسی دفتر میں اتنا کام تو کسی سے نہ لیا جاتا ہوگا۔ اور پھر ان کو دیکھتی تھی کہ ان کو اتنی محنت کے باوجود نہ اس نوکری سے کوئی شکایت ہے نہ کام کی زیادتی سے جیسا پریشان ہونا چاہیے یہ پریشان ہیں۔ بلکہ مجھ کو تو ان پر ہمیشہ ترس آتا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اگر یہی حال رہا تو یہ اپنی صحت کھودیں گے۔ مگر وہاں تو دوسرا ہی کھیل ہورہا تھا۔

نازو نے کہا۔ "ایسا ویسا کھیل فیاض صاحب کہتے تھے کہ دن بھر دفتر میں ٹیلیفون ہوتے ہیں۔ سہ پہر کو دفتر سے واپسی پر اسی کے یہاں چائے پیتے ہیں اور پھر کلب میں نہ ان کو کسی کھیل سے دلچسپی ہے نہ کسی اور تفریح سے، بس دونوں سب سے الگ تھلگ نہ جانے وہ کون سی باتیں کرتے ہیں کہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتیں اور وہ ان سے ایسی ایسی ناز برداریاں کرتی ہے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا ہے......

"......اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا حال ہی میں وہ الہ آباد گئے تھے؟"

بیگم نے کہا۔ "ہاں پچھلے ہی ہفتے تو گئے تھے تین چار دن کے لیے۔"

نازو نے کہا۔ بس تو ٹھیک ہے۔ اصل میں وہ اپنے کسی مریض کے ساتھ الہ آباد گئی تھی، کوئی رانی صاحبہ تھیں۔ وہ چار سو روپیہ روز پر اس کو لے کر گئی تھیں اور اس نے ان حضرات کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ سنا تو یہ ہے کہ اس دسمبر کی تعطیل میں دونوں کی سول میرج ہوجائے گی۔"

اب بیگم کی حالت قابل دید تھی۔ پہلے تو چہرے پر ہوائیاں اڑتی رہیں اس کے بعد گردن جھکا کر بیٹھ گئیں اور پھر فیاض کی پیشگوئی لفظ بلفظ پوری ہوکر رہی یعنی لگیں سسکیاں بھر بھر کر رونے۔ ادھر ہماری حالت غیر ہونا شروع ہوئی۔ کئی مرتبہ ارادہ

کیا کہ اس مذاق کو ختم کر دیا جائے مگر ہر مرتبہ فیاض نے اس بری طرح گھورا کہ ہم سہم کر رہ گئے۔ ہائے اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ذرا سے شوق کے پیچھے اپنی معصومہ بیوی پر یہ قیامت توڑ رہے تھے۔ اس کے ان آنسوؤں کی قیمت کا اندازہ اگر ہم کر سکتے تو بیڑا پار تھا۔ مگر وہ یہ موتی ہمارے ایسے اندھے کے سامنے بکھیر رہی تھی۔ بے چاری دیر تک اسی طرح روتی رہی اور نازو اس کو سمجھاتی رہیں کہ آخر اس طرح رونے سے کیا فائدہ ہے۔ اس قسم کے امتحان کے موقعوں پر تو دل کو مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے۔ تم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس کو بھی خدا نے دیکھا ہے اور وہ جو کچھ تمھارے ساتھ کر رہے ہیں، اس کا دیکھنے والا بھی وہی ہے۔ اب اس وقت تو سوال یہ ہے کہ اس شادی کو کس طرح رکوا دیا جائے۔

بیگم نے بھرائی آواز کے ساتھ کہا۔ ”شادی ہرگز نہ رکوائی جائے گی۔ اگر ان کی خوشی اسی میں ہے تو یہ بھی سہی۔ جب ایک مرتبہ ان کو کسی دوسری عورت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تو ان کو یقیناً شادی کر لینا چاہیے مگر مجھے ان سے شکایت صرف یہ ہے کہ آخر میرا کیا قصور تھا۔ مجھ سے کون سی ایسی کوتاہی ہوئی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ پھر لگیں پھوٹ پھوٹ کر رونے اور ہم نے پہلو بدلنا شروع کیے۔ مگر فیاض نے پھر آنکھ دکھائی لہٰذا چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ اب نازو نے ان سے کہا۔

”بہن ان مردوں کا بھی کوئی اعتبار ہے اس جنس کے آس پاس بھی وفا کا گذر نہیں ہوا ہے۔ ہم تم اپنی جان بھی دے دیں، سر بھی کاٹ کر رکھ دیں تو ہمارے ساتھ ان کا یہی سلوک ہوگا جیسا کہ تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم لاکھ کچھ کریں مگر نہ تو ہم کو وہ نمائشی ادائیں آ سکتی ہیں جو ان سوسائٹی گرلس کو آتی ہیں نہ ہم ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر تاش کھیل سکتی ہیں۔ نہ ہم اس قدر سوسائٹی کے آداب سے واقف ہیں نہ ہم ہر قسم کی محفلوں میں چمک سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم کو ایسا بنایا ہی نہیں گیا۔ مگر

توقع ہم سے یہی کی جاتی ہے اور یہی کمی ہے جو ہم میں محسوس کی جاتی ہے مگر نتیجہ اس کا ہوتا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ہے اور قدر و عافیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ لوگ تو ان ہی سے خوش رہ سکتے ہیں جو ہر وقت اپنے ٹھسے ان کو دکھائیں، اپنی جوتیاں سیدھی کرائیں اور پنے ناز اٹھواتی رہیں۔ ہم نے تو ان کو مجازی خدا سمجھ سمجھ کر سروں پر چڑھا لیا ہے نا۔ لہٰذا پیر کی جوتی کی عزت زیادہ ہے اور ہماری اتنی بھی نہیں۔“

بیگم نے سب کچھ سن کر کہا۔ ”مگر وہ تو ایسے نہ تھے، نہ جانے ان پر کیا جادو کیا گیا ہے۔“

نازو نے کہا۔ ”ارے نہ کوئی جادو کرتا ہے نہ کچھ، یہ سب کے سب ایک ہی قسم کے مداری ہوتے ہیں۔ میں تو فیاض صاحب کے متعلق ہر وقت اس قسم کی خبریں سننے کو تیار رہتی ہوں اور مجھ کو تعجب ہے کہ اب تک ان کو کسی نے کیوں نہیں پوچھا۔“

بیگم نے اسی عالم میں کہا۔ ”چار پانچ مہینے سے تو خیر ان کو نہ گھر کی کسی بات کا علم ہے نہ اس بات کی کوئی خبر کہ میں زندہ ہوں کہ مر گئی ہوں۔ مشکل سے ایک آدھ بات چوبیس گھنٹہ میں ہوتی ہو تو ہو جاتی ہو مگر اس سے پہلے تو ان کو بغیر میرے چین ہی نہ تھا۔“

نازو نے کہا۔ ”اس وقت تک ان کی راحت جان اور کوئی نہ تھی اب بھلا تم کس کھیت کی مولی ہو۔ جب ان کو ایک ولایت سے لوٹی ہوئی نور کی پتلی مل گئی ہے تو تم کس شمار قطار میں ہو۔ شکر کرو کہ اب تک تم سے یہ بات چھپائی جا رہی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ پردہ بھی اڑ جائے گا۔“

بیگم نے کہا۔ ”خدا کے لیے نازو بس کرو۔ میں دنیا کی ہر چیز برداشت کر سکتی ہوں مگر مجھ سے یہ مصیبت برداشت نہ ہوگی۔ میں اس کی پوری چھان بین کروں گی

اور اگر یہ سچ ہے تو پھر میرا خدا ہی حافظ ہے۔”

نازو نے کہا۔ “لو اور سنو۔ اب تک بے چاری کو شک ہے۔ ارے، بہن میری لاکھ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ بے حیا بن کر جب تک نہ رہا جائے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ نہ چھان بین کرو نہ کچھ اور، تم کو چپ کی داد ضرور ملے گی۔”

اب بیگم نہایت خاموشی کے ساتھ آنسو بہاتی رہیں اور نازو ان کو اسی طرح عبرت کے مناظر دکھا دکھا کر گویا تسلی دیتی رہیں اور فیاض نے ہم کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم چپکے سے اٹھ کر فیاض صاحب کے ساتھ باہر آ گئے اور دونوں فوراً روانہ ہو گئے۔ گھر سے نکل کر کلب کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ دل ایسا بجھا ہوا تھا کہ کلب جانے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ ہم تو اس وقت جا کر اپنی دلچسپیوں میں کھو جائیں گے اور وہ بے چاری اب انگاروں پر لوٹے گی۔ کانٹوں پر کروٹیں بدلے گی اور نہ جانے رو رو کر کیا حال کر لے گی۔ چنانچہ ہم نے فیاض سے کہا۔ “بھئی اس وقت کلب جانے کو دل نہیں چاہتا۔ بس گھر ہی جانے کا ارادہ ہے۔”

فیاض نے کھا جانے کے انداز سے آنکھیں نکال کر کہا۔ “میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم ناقابلِ علاج قسم کے مریض ہو۔ پہلی ہی خوراک میں گھبرا گئے، حالانکہ تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم کو یہ تمام مناظر دیکھنا پڑیں گے۔ اب آپ گھر جا کر کیا کریں گے۔ بیوی سے گلے مل کر روئیں گے۔ کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی کریں گے۔ آخر معلوم تو ہو کہ ارادہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ میرے شکر گذار ہوتے کہ پہلی ہی خوراک کس قدر تیر بہدف ثابت ہوئی ہے، اب یہ بد پرہیزی ابھی سے کرنا چاہتے ہیں۔ خبردار جو گھر جانے کا نام لیا۔ چلو سیدھی طرح کلب، ارے میاں ابھی تو ۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ابھی تو آپ کو نہ جانے کیسے کیسے امتحانوں سے گذرنا ہوگا

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر اسی طرح کمزوری دکھاؤ گے تو ہو چکا کام۔”

ہم نے کہا۔ “مگر غور تو کرو۔ کہ یہ کیسی درندگی اور سنگدلی ہے کہ اپنی ذرا سی دلچسپی کے لیے اس بے چاری کو تکلیف دے رہے ہیں۔”

فیاض نے کہا۔ “اپنے قابل قدر ضمیر سے کہو کہ فی الحال آرام کرے اپنی نسلی شرافت سے کہو کہ وہ ذرا خاموشی کے ساتھ تماشہ دیکھے۔ سنگدلی اور درندگی تو یہ اس وقت ہوتی جب واقعی تم ان کی حق تلفی کر رہے ہوتے، مگر تمھارا ارادہ نیک ہے تم صرف ایک ذرا سی آزادی حاصل کرنے کے لیے جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے یہ جدوجہد کر رہے ہو اپنے کو چور کی بجائے ساہوکار ثابت کرنا ہے۔ لہٰذا جس وقت وہ اس ڈرامہ کے نتیجہ پر پہنچیں گی۔ تمام حالات کی خود بخود تلافی ہو جائے گی۔ تم اس وقت کی غم آگینی کے بجائے نتیجہ کی مسرت پر غور کرو۔ دوا کی تلخی کے بجائے صحت کاملہ اور دفعہ کاملہ کے متعلق سوچو۔ کیا سمجھے۔ اب جو آئندہ اس قسم کی کمزوری ظاہر کی تو بنچ پر کھڑا کر دوں گا۔”

(۹)

ڈاکٹر شیلا تو واقعی بلائے بے درماں بنتی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اب ان کے سلسلہ میں ہمارا باقاعدہ مذاق کلب والے اڑایا کرتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں تو ایسی ایسی باتیں ہوتی تھیں کہ خدا کی پناہ! لیکن ان کے سامنے بھی اب کھلم کھلا یہ چوٹیں چلنے لگی تھیں۔ مگر ان کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ آج بھی جس وقت ہم کلب پہنچے تھے، یاروں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔ ان سب میں رمیش پیش پیش تھے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ سب سے زیادہ اس سلسلہ میں رمیش کو دلچسپی یوں تھی کہ شیلا صاحبہ کے پہلے شکار یہی حضرت تھے۔ بلکہ عام خیال یہ تھا کہ بہت جلد ان دونوں کو شادی کی حد تک ان کے باہمی جذبات پہنچا دیں گے۔ مگر رمیش سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ خود جذبات کی رو میں بہہ گئے اور شیلا کی پرستاریاں شروع کر دیں۔ حالانکہ شیلا عجیب و غریب قسم کی عورت ہے۔ وہ خود محبت کرنا چاہتی ہے اور اس سے جو کوئی محبت کرے وہ اس سے دور بھاگنے لگتی ہے۔ ہم لوگ تو اس کو پرچھائیں کہا کرتے ہیں کہ اگر اس سے دور بھاگا جائے تو وہ تعاقب کرتی ہے اور اگر اس کا تعاقب کیا جائے تو دور بھاگتی ہے۔ رمیش بے چارہ یہ بھگت چکا ہے۔ پہلے تو شیلا نے اس پر جان دینا شروع کر دی۔ ہر وقت ''رمو'' کا وظیفہ تھا۔ رمیش کے ساتھ رہنا، رمیش کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، مختصر یہ کہ شیلا کو بغیر رمیش کے چین ہی نہ تھا۔ مگر جب رمیش بھی اس کے لیے بے قرار رہنے لگا اور اس بے قراری کا اس کو اندازہ ہو گیا تو اس نے کنارہ کشی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ رمیش کو بے حد تکلیف تھی۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اور بہت دنوں تک شیلا سے کھنچنے کے بعد اس کی طرف رجوع ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ مستحکم ہو جائے۔ مگر شیلا بھی اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور تھی۔ وہ شعلوں سے کھیل کھیل کر دامن بچانے کی عادی رہی ہے۔ اس نے جب رمیش کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ مایوس ہو گئی اور جب کلب کے دوستوں نے رمیش کی وکالت کی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نہ جانے کیوں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جس سے میں محبت کروں وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے۔ یہ تو ایک قسم کی تو تو، میں میں ہوئی کہ چونکہ محبت کا جواب محبت ہے، لہٰذا محبت کے جواب میں محبت ضرور کی جائے۔ میں اس لین دین کی قائل نہیں ہوں۔ بظاہر یہ دلیل عجیب مجذوبانہ سی معلوم ہوتی تھی۔ مگر شیلا اس سلسلہ میں گھنٹوں تقریر کر سکتی تھی اور اس سلسلہ میں اب تک رمیش کا ایسا ایسا مذاق اڑاتی تھی کہ بے چارہ اپنی جان سے عاجز آ چکا تھا۔ اس سے ہم لوگوں نے اکثر پوچھا کہ خیر اس غریب نے تم سے محبت کی یہ تو اس کی شامت تھی۔ مگر تم کو جو اس سے محبت تھی وہ آخر کیا ہوئی۔ اس کے جواب میں وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ میری محبت کو اس کی محبت کھا گئی۔ اس نے غالباً میری محبت کو اس قدر ارزاں سمجھ رکھا تھا کہ اس کو گویا ان کی محبت خرید سکتی تھی۔ مگر جس دن مجھ کو ان حضرات کی محبت کا علم ہوا، میں نے اپنی محبت کو شرم دلائی کہ دیکھ کمبخت ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

اگر تو اہل نظر ہے تو اپنی اس آبرو کے جانے سے پہلے ڈوب مر۔ چنانچہ وہ بے چاری تھی ذرا غیرت دار، ڈوب مری۔ رمیش صاحب شروع شروع میں بڑے رنگ لائے۔ تنہائیوں میں روئے۔ گوشہ نشیں بنے۔ شیلا کے در پر دھونی رمائی اور نہ جانے کیا کیا جتن کیے مگر جب شیلا نے نہایت شفقت کے ساتھ ان کو سمجھا دیا کہ بے چین نہ کرو میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ میں اب قیامت تک تم سے دلچسپی نہیں لے سکتی تو آخر

رفتہ رفتہ ان کو صبر آ گیا اور جب وہ پھر آدمی بن کر کلب آنے جانے گے تو کچھ دنوں کے بعد شیلا نے مجمع عام میں پھر یہ ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔ ’’ہمارے رمیش صاحب کی محبت بھی کس قدر ان کی تابع فرمان ہے جب چاہا ہو گئی شروع۔ جب اشارہ کیا ہو گئی ختم۔ ایسی تابع دار محبت مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ کہیں ایک بے گناہ کا خون میری گردن پر نہ ہو۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آپ کی محبت مومی ثابت ہوئی۔‘‘ اس قسم کی چوٹوں سے ظاہر ہے کہ رمیش کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ مگر اب کچھ دنوں سے رمیش نے عقل سے کام لے کر اس جنون کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے رومان کو اپنی حماقت تسلیم کر کے وہ خود بھی اس مذاق میں حصہ لینے لگا تھا۔ مگر ہمارے سلسلہ میں سب سے پیش پیش آپ ہی تھے۔ چنانچہ آج بھی شیلا کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آپ نے ہم کو دیکھتے ہی کہا۔

’’قیس سجادہ نشین آ کے ہوا میرے بعد۔‘‘

اخلاق نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تو خیر آپ غلط کہتے ہیں۔ وہ تو آپ کی طرح قیس نہیں بنا ہے بلکہ اب تک نہایت عقل مندی سے کام لے کر دور ہی بھاگ رہا ہے۔‘‘

رمیش نے کہا۔ ’’ارے بڑا چالاک ہے۔ میرا حشر دیکھ چکا ہے نا۔ لہٰذا انتظاماً یہ کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ شیلا کی افتادِ طبیعت کو سمجھ بوجھ کر بے چارہ اپنے جذبات کو چھپائے نہ تو کیا کرے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’بھیا نہ خدا کے فضل سے میری آنکھیں کمزور ہیں نہ دماغ میں اب تک فتور ہے کہ میں شیلا کے لیے جذبات چھپاتا یا آپ کی طرح اچھالتا پھروں۔ مجھے تو اس کلب ہی سے محض ان محترمہ کی وجہ سے وحشت سی ہونے لگی ہے۔‘‘

اخلاق نے کہا۔ ’’ارے بھئی کل کا قصہ بھی سنا۔ اس عورت نے سر میں درد پیدا کر دیا۔ دو گھنٹے تک گانا سنایا ہے مسعود کے یہاں۔ سمجھتی یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر موسیقار اور کوئی شاید ہی ہو۔‘‘

فیاض نے کہا۔ ’’جی موسیقار؟ ارے صاحب وہ ہرفن مولا ہے۔ اس روز کلب کے سالانہ ڈنر میں مکرجی کے پیچھے پڑ گئی۔ معاشیات کے سلسلہ میں بڑے بڑے ڈاکٹر مکرجی کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے اور آپ کی اس کنیز نے خدا نظرِ بد سے بچائے، مسلسل دو ڈھائی گھنٹہ تک ان کا دماغ ایسا چاٹا ہے کہ شاید ہی کسی نے معاشیات کے سلسلہ میں ایسی باتیں کبھی ان سے کی ہوں گی۔ لطیفہ یہ تھا کہ وہ جو بات کہتے تھے اس کو تو یہ اللہ کی بندی سنتی نہ تھی اور نہ جانے کہاں کہاں کی ہانک رہی تھی۔ بھلا غضب خدا کا معاشیات کے سلسلہ میں بحث اور آپ نے پڑھنا شروع کیے اقبال کے شعر کہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب ہمارا شاعر کہہ گیا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے

ایک فلک شگاف قہقہہ سب نے بلند کیا اور بمشکل تمام اخلاق نے کہا۔ ’’اس فیاض کو بھی تصنیف کا ایسا ملکہ حاصل ہے کہ فی البدیہہ یہ دو مصرعے اس کے ذہن میں آ گئے۔‘‘

رمیش نے کہا۔ ’’نہیں بھئی یہ تصنیف نہیں ہے، وہ اسی طرح شعر و شاعری میں دخل دیتی ہے۔ ابھی چار پانچ روز ہوئے یہاں کچھ بحث تھی جدید شاعری اور قدیم تغزل کے سلسلہ میں۔ شعیب صاحب بڑے عمدہ پیرایہ میں بحث کر رہے تھے اور طاہر ترقی پسند ادب کی طرف سے وکالت کر رہے تھے کہ ایک دم سے آپ پھٹ پڑیں اور چھوٹتے ہی فرمایا کہ دیکھئے شعیب صاحب، میرے خیال میں سب سے بڑا ترقی پسند شاعر میر تقی میر تھا۔‘‘

سب کو پھر ہنسی آ گئی مگر رمیش نے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔ ”اے بھئی سنو تو سہی۔ ان کی اس مداخلت پر شعیب صاحب نے برجستہ کہا۔ ”غالباً اس لیے کہ میر تقی میر دومنہے تخلص کے شاعر تھے۔ یعنی تقی نام اور ادھر بھی میر اور ادھر بھی میر۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جی نہیں بلکہ میں نے جس قدر پڑھا ہے اس سے پتہ یہی چلتا ہے کہ میر سے ترقی پسند شاعر شاید ہی کوئی دوسرا ہوا ہو۔ دیکھئے اس کا یہ شعر کیسا ترقی پسند ہے کہ ؎

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

سب نے پھر قہقہہ بلند کیا اور فیاض صاحب نے کہا۔ ”اب فرمایئے اخلاق صاحب، رمیش ترقی پسند ادیب ہے یا میں۔ اس نے بھی بیٹھے بیٹھے کیسی گھڑی ہے۔“

ہم نے رمیش کی طرف سے گواہی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شعیب خود مجھ سے کہتے تھے کہ تمھارے کلب میں جو ڈاکٹر شیلا ہیں ان کی باتوں کو تم لوگ کس طرح برداشت کر لیتے ہو۔ وہ میر کو ترقی پسند شاعر بتا رہی تھیں اور بلاوجہ ادبی گفتگو میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔“

رمیش نے کہا۔ ”ارے بھئی شعیب بھلا چوکنے والا ہے اس نے اسی وقت کہہ دیا کہ ڈاکٹر شیلا بات یہ ہے کہ یہ ہے ادبی بحث اور اس کی شناخت نسوانی امراض کی شناخت سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ اس کھلی ہوئی بات کو بھی آپ نہ سمجھیں اور کہنے لگیں کہ جی ہاں اختلاف دوسری چیز ہے مگر میں تو میر تقی میر سے ترقی پسند شاعر کسی اور کو سمجھتی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعیب اور طاہر کو یہ گفتگو ختم کرنی پڑی۔“

فیاض نے کہا۔ ”بھئی سنو ...... آج سے میں ذرا ان سے کچھ طبی قسم کی گفتگو شروع کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ مجھ کو طب میں کس قدر دخل ہے۔ مگر شیلا کو تو

بہرحال یہ سمجھانا ہے کہ اگر وہ علم و ادب، تاریخ اور معاشیات پر رائے زنی کر سکتی ہیں تو میں بھی ایسا گیا گذرا نہیں ہوں کہ طب پر رائے زنی نہ کر سکوں۔ پھر دیکھئے گا کہ ان کا کیا حال ہوتا ہے۔“

اس تجویز کو ہم سب نے پسند کیا اور ابھی اس پر تفصیل سے گفتگو نہ ہونے پائی تھی کہ دھڑ سے ایک دروازہ کھلا۔ کھڑبڑ کے ساتھ کچھ کرسیاں کھینچی گئیں اور نہ جانے کیا گنگناتی ہوئی ڈاکٹر شیلا نازل ہو گئیں۔ سب سے پہلے ہم کو دیکھ کر فرمایا۔ ”ہلو شوکی! میں تو سمجھی تھی کہ آج تم شاید نہ آ سکو۔“

اخلاق نے کہا۔ ”خیر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

شیلا نے ایک کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟“

رمیش نے کہا۔ ”یعنی یہی کہ آپ ہمیشہ غلط بات سمجھا کرتی ہیں۔“

شیلا نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ”یعنی آپ کو سمجھنے میں جو غلطی کی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے نا۔“

سب ہنس دیئے اور اخلاق نے کہا۔ ”بھئی رمیش اس وقت چپک گئی۔ شرافت کے ساتھ تسلیم کر لو۔“

فیاض نے کہا۔ ”ہاں صاحبان تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اقبال کے سلسلہ جوش کا یہ تبصرہ کہ

ہائے وہ ناداں شاعر وہ دانا حکیم

میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ جوش نے اقبال کی حکمت کو تسلیم کر کے اس کی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش محض اس لیے کی ہے کہ جوش خود شاعر ہیں اور اقبال کو حکیم تسلیم کر سکتے ہیں مگر شاعر اس لیے تسلیم کرنا نہیں چاہتے کہ شاعری کو اپنی براث سمجھتے ہیں۔“

جب توقع شیلا پٹ سے بولیں۔ “Say فیاض، اقبال حکیم بھی تھا۔”

کچھ لوگوں کو تو ہنسی آنا شروع ہوئی مگر شیلا اس کو محسوس نہ کر سکیں اور فیاض نے نہایت سنجیدگی سے ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ “ایسا ویسا حکیم۔ دنیا بھر میں شہرت تھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اس کا لوہا مانتے تھے۔ بعض علاج تو ایسے معرکے کے اس نے کیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ یاد ہے اخلاق صاحب اس نے امیر امان اللہ خاں کا جو علاج کیا تھا۔”

اخلاق نے کہا۔ “ہاں صاحب اس میں تو کمال ہی کر دیا کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ یہ جانبر کیونکر ہو گئے مگر سنا ہے کہ تین نسخوں میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔”

فیاض نے کہا۔ “گردے میں درد تھا۔ جس کی وجہ سے مستقل طور پر نزلہ کی شکایت پیدا ہو گئی تھی اور آواز روز بروز گلوگیر ہوئی جاتی تھی۔”

شیلا نے چونک کر کہا۔ “کیا What Nonsense یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ گردے میں درد کا نزلہ سے کیا تعلق آواز پھر آواز پڑ جانا۔”

فیاض نے کہا۔ “جی ہاں بالکل یہی شکایتیں تھیں۔ آخر اقبال نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ پانی بالکل نہ پئیں۔ چنانچہ تین مہینے پانی یا کسی قسم کی کوئی رقیق چیز ان کو نہ دی گئی۔”

رمیش نے کہا۔ “بلکہ سنا ہے کہ دوا تک گولیوں کی شکل میں دی گئی تھی۔”

فیاض نے کہا۔ “جی ہاں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گردے کا درد بمشکل تمام گردے سے نکل کر پانی کی تلاش میں معدے تک گیا اور اب اقبال نے اس کو معدے کے پاس دیکھا تو ایک مسہل دے کر ایسا اس درد کو نکالا ہے کہ حیرت ہو گئی سب کو۔”

شیلا نے پاگل ہو جانے کے انداز سے کہا۔ “نہ جانے آج تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کسی مجذوب کی بڑ ہے یا کسی طلسم ہوشربا کا کوئی ٹکڑا۔ ایک بات تو سمجھ آنے والی ہے نہیں۔”

اخلاق نے کہا۔ “میری خالہ کو بھی ایک مرتبہ یہ شکایت ہو گئی تھی کہ داہنے پیر میں اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے۔ کسی نے کہا گنٹھیا ہے، کسی نے بتایا فالج کا اثر ہے، کسی کا خیال تھا کہ یہ عرق النساء ہے، مگر اقبال نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ اختلاجِ قلب ہے۔”

شیلا نے چیخ کر کہا۔ “پیر میں اختلاج قلب؟”

فیاض نے کہا۔ “کیوں کیا ہوا۔ قلب کا تعلق جسم کے ہر حصہ سے ہے۔ ہے یا نہیں۔”

شیلا نے کہا۔ “بابا یہ ڈاکٹری ہے۔ اس میں دخل نہ دو اچھا ہے۔”

اخلاق نے کہا۔ “یہ ہم دخل نہیں دے رہے ہیں بلکہ یہ اقبال کی رائے ہے جس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اتنا بڑا حکیم تھا کہ حکیم اجمل خاں یا ڈاکٹر انصاری اگر کبھی بیمار ہوتے تو اس سے علاج کراتے تھے۔”

شیلا نے جل کر کہا۔ “کراتے ہوں گے علاج۔ مگر یہ بات تو تم پاگلوں جیسی کر رہے ہو کہ پیر میں اختلاجِ قلب۔”

فیاض نے کہا۔ “جو بات آپ کی سمجھ سے بالاتر ہو اس میں آپ کو دخل دینے کی آخر کیا ضرورت ہے۔”

شیلا نے کہا۔ “بابا میں نے بھی کچھ نہ کچھ ڈاکٹری پڑھی ہے۔ کم سے کم تم لوگوں سے زیادہ ان باتوں کو سمجھ سکتی ہوں۔”

رمیش نے کہا۔ “مگر مجبوری تو یہ ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ رہی ہیں۔”

شیلا نے کہا۔ “کون؟ آپ بولے۔ آپ تو خیر جس قدر سمجھ دار ہیں اس کا

اندازہ کرنے سے ہی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کا حال دیکھ کر تو مجھے واقعی تعجب ہو رہا ہے۔ کہیں میرے آنے سے پہلے کوئی دورہ تو نہیں ہو چکا ہے۔“

اخلاق نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو فیاض صاحب اصل بحث یہ تھی کہ واقعی جوش کی یہ تنقید درست ہے یا نہیں ہے۔ آپ کے نزدیک جوش نے اقبال کو دانستہ طور پر ایک دوسری لائن پر لگا کر اپنے لیے راستہ صاف کیا ہے۔“

فیاض نے بڑی خطرناک قسم کی سنجیدگی کے ساتھ سگار کا کش لیتے ہوئے۔ ”جی میری رائے میں تو جوش اپنے اس تبصرے میں دانستہ طور پر بہکتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ انفرادیت کا سکہ ان کا دل قبول کر رہا ہے۔ مگر اس طرح ان کے نزدیک خود ان کی انفرادیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اقبال کے سپرد ایک الزام منسوب کرتے ہوئے شاعری کے تنہا مالک بن گئے۔“

شیلا نے پھر ٹانگ اڑائی۔ ”کیا مصرعہ ہے ذرا پھر تو پڑھو

فیاض۔“

فیاض نے اسی سنجیدگی سے پڑھا۔

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

شیلا نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک تو ہے۔ اس میں آخر جھگڑے کی کیا بات ہے۔“

اخلاق نے کہا۔ ”جھگڑا اس بات کا ہے کہ جوش کہتے ہیں کہ صرف اقبال کا ترانہ بانگِ درا کیوں ہے۔“

شیلا نے کہا۔ ”یہ بانگِ درا تو شاید اقبال ہی کی کتاب ہے نا۔“

فیاض نے کہا۔ ”جی ہاں اقبال کے سب سے پہلے ناول کا نام بانگِ درا ہے۔ اسی کے کاپی رائٹ کا جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ اب بتائیے کہ ذرا سی بات کے لیے اچھے دل برے کر رہے ہیں۔“

شیلا نے کہا۔ ”جب وہ کتاب اقبال کے نام سے چھپ چکی اور اب تک اس پر اقبال کا نام لکھا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ اس پر کسی اور کا حق نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ذکر اس وقت کیوں چھڑ گیا۔ بات ایسی ہونی چاہیے جس سے سب دلچسپی لیں۔ اب دیکھیے ناشو کی بے چارے چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کو بس یہ انتظار ہے کہ رمی شروع ہو جائے۔“

اخلاق نے کہا۔ ”کان پکڑیے صاحب ان کے ساتھ رمی کھیلنے سے۔ دس پندرہ دن سے اس شخص نے ڈورے ڈالنا شروع کیے ہیں تو کسی طرح جیت ختم نہیں ہوتی۔“

رمیش نے کہا۔ ”کل آپ کا دن ذرا خراب تھا فرماتے ہیں کہ محض دو سو چالیس کی جیت رہی۔“

فیاض نے کہا۔ ”ارے بس! اس طرح بے چارے کا کام کیونکر چل سکتا ہے۔ اس قدر اخراجات، پھر لڑائی کا زمانہ ہر چیز گراں۔ اگر اس زمانہ میں احباب نے بخل سے کام لیا تو یہ بے چارہ تو گویا بے موت مرا۔“

ہم نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ ”یہ تو خیر ایک دوسری بات ہے مگر ڈاکٹر شیلا نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ گویا اس اجتماع میں صرف ایک میں ایسا ہوں جس کو اس قسم کے ادبی مباحث سے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔“

شیلا نے جلدی سے کہا۔ ”No-No آپ میرا مطلب نہیں سمجھے میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ چپ بیٹھے ہوئے ہیں اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں کہ یا تو آپ بے حد دلچسپی لے رہے ہیں اور اس قدر محویت ہے کہ کھوئے گئے ہیں یا کوئی دلچسپی نہیں

لے رہے ہیں۔ مگر سوال تو ہے کہ اب یہ بحث کب تک جاری رہے گی۔"

رمیش نے کہا۔ "بھئی اخلاق میرا خیال یہ ہے کہ آج ان حضرات کو ہرانا چاہیے بلکہ قیاس کہہ رہا ہے کہ یہ ضرور ہاریں گے۔"

اخلاق نے کہا۔ "تو بسم اللہ اگر شامت ہی آ گئی ہے تو مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ۔ نکالیے تاش۔"

میز کے گرد ہم سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ہر چند کہ شیلا کی گفتگو پر ہنسی کو اس قدر ضبط کیا تھا کہ پسلیوں میں درد ہو رہا تھا اور دم گھٹتا جاتا تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ شیلا کو کہیں ہٹا کر ذرا جی کھول کر ہنس لیں مگر شیلا اب کہاں ٹلنے والی تھی۔ مجبوراً اسی حالت میں کھیل شروع کرنا پڑا۔

(۱۰)

آج کل ہمارے گھر کا نقشہ کچھ عجیب سا تھا ۔
آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

مگر بظاہر بیگم صاحبہ ہم پر کھلنے نہ دیتی تھیں کہ ان کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور ادھر ہم اس طرح بے خبر بنے ہوئے تھے گویا ہم کیا جانیں کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے، مگر ان کی مشکوک نگاہوں میں ان کا مایوس تبسم اور ان کی عام سوگواری میں عجیب ویرانیاں تھیں۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہر نظر جو بظاہر ہماری طرف اٹھتی تھی۔ ایک نہ ایک حسرت کا جنازہ اٹھاتی ہوئی اٹھتی تھی، ہر ٹھنڈی سانس کے ساتھ ارمانوں کے خون کی بو آتی تھی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں اس کی مجسم شرح بن کر رہ گئیں۔ ہر نظر ایک شکایت کرتی تھی۔ ہر انداز ایک داستان سرد مہری سناتا تھا اور ہر ادا پکار پکار کر ہم کو بے وفا کہہ رہی تھی۔ فیاض کمبخت نے عجیب مصیبت میں بتلا کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ ساتھ دیکھ رہے تھے۔ جانتے تھے کہ ہم بے قصور ہیں اور بے گناہ پر ظلم خواہ مخواہ توڑا جا رہا ہے، مگر پھر بھی چپ رہنے کے لیے مجبور تھے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ اس کو زن مریدی کہہ لیجئے یا کچھ مگر بیوی سے محبت ہونا کوئی بری بات تو ہے نہیں اور محبت میں بڑے بڑے افلاطون کو بھی دبنا پڑتا ہے۔ ہم کو بھی اپنی بیوی سے واقعی محبت تھی اور ہم واقعی ان سے دبتے تھے۔ لہٰذا ان کو بھی حق تھا کہ وہ ہم کو دبائیں۔ ہم پر حکومت

کریں۔ ہم پر اپنا زور چلائیں۔ چنانچہ اس قصہ سے پہلے یہی سب کچھ ہوا کرتا تھا اور آج کل ان کی طرف سے ہو رہی تھیں نیازمندیاں، خاکساریاں، اطاعتیں اور فرماں برداریاں جو ہمارے لیے انتہائی تکلیف دہ تھیں۔ مگر اس تغیر کو محسوس کرتے ہوئے بھی ہم ایسے بنے ہوئے تھے گویا بڑے ننھے ہیں۔ بڑے بھولے ہیں۔ حالانکہ دل ہی جانتا تھا۔ جب وہ ہاتھ دھلانے کے لیے خود کھڑی ہو جایا کرتی تھیں، یا دفتر جانے کے وقت ٹوپی پر برش کرنے کے لیے لپکتی تھیں۔ آج تک کبھی اس قسم کی خدمات بھول کر بھی ان سے سرزد نہ ہوئی تھیں۔ مگر ایک بے ساختگی میں وہ یہ سب کچھ کیا کرتی تھیں۔

ایک بات اور نظر آ رہی تھی کہ آج کل بڑی پابندی سے پانچوں وقت نمازیں ادا ہو رہی تھیں اور ہر نماز کے بعد اس قدر تفصیلی دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ اگر وہ سب کی سب قبول ہو جائیں تو اس دنیا کی وسعتوں کو شکوۂ کوتاہی داماں ہو جائے۔

آج قصہ دراصل یہ ہوا کہ فیاض سے ہم کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ ان کی نازو ہمارے یہاں جانے والی ہیں۔ دوسرے ایک عجیب بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ فیاض نے اپنی بیوی کو دراصل اپنا رازدار نہیں بنایا ہے بلکہ ان کو بھی یقین دلایا ہے کہ ہمارا اور شیلا کا قصہ دراصل چل رہا ہے، بلکہ نازو سے یہاں تک کہا کہ تم کو مجھ پر جو شبہے تھے وہ اب اس طرح پورے ہو رہے ہیں کہ شوکی اور شیلا کا رومان بڑے زوروں پر ہے، بلکہ اگر تم رفو کو بروقت ہوشیار نہ کیا تو عین ممکن ہے کہ بے چاری کا گھر تباہ نہ ہو جائے۔ فیاض سے اس جھوٹ کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس قسم کے معاملات میں کسی کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ معلوم نہیں کس کے دل میں آ جائے کہ راز کو افشاء کر دوں۔ عورتوں کے پیٹ میں بات مشکل ہی سے ٹھہر سکتی ہے۔ مجھے خود اپنی بیوی کی طرف سے یقین نہ تھا کہ وہ رفو سے یہ بات چھپا سکیں گی۔ دوسرے ایک والہانہ قسم کی ہمدردی جو اس قسم کے موقعوں پر ایک عورت کو دوسری عورت سے ہو جایا کرتی ہے قدرتی طور پر پیدا نہ ہوگی۔ لہٰذا میں نے نازو کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے اور وہ سچے دل سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر تم کو نہایت بدمعاش، نہایت بے وفا، نہایت ظالم اور سخت سنگدل سمجھتی ہیں۔ اور تمھارا مقابلہ کر کے مجھ کو موتیوں میں تولنے کے قابل شوہر سمجھے ہوئے ہیں۔

بہرحال فیاض سے یہ معلوم کر لینے کے بعد ہمارے یہاں نازو جا رہی ہیں۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ دفتر سے کلب جانے کی بجائے پہلے گھر آئیں اور اگر موقع مل سکے تو ذرا سنیں کہ حالات اب کس منزل پر ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی بیگم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور پریشان ہو کر ہماری طرف آتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیسی ہے طبیعت؟"

ہم نے اس سوال کو نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو ہوں۔ یہ طبیعت کے متعلق کیوں آپ کو شبہ ہوا۔"

بیگم نے شرمندہ ہوتے ہوئے مگر دراصل غیر ارادی طور پر شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ "بے وقت آ گئے تو میں نے کہا نہ جانے کیا بات ہے۔"

واقعی بے چاری کے لیے پریشانی کی بات بھی تھی۔ چھ مہینے سے جو معمول بنا ہوا تھا اس کے قطعاً خلاف آج یہ بات ہوئی تھی۔ وہ قدرتی طور پر یہی سمجھیں کہ طبیعت خراب ہو گئی ہے ورنہ بھلا یہ اور اس وقت گھر آتے۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم اچھے خاصے ہیں تو آج عید کا چاند نکلنے پر تعجب ہوا ہوگا۔ بہرصورت ہم نے کچھ واجبی سی باتیں کیں اور یہ کہہ کر باہر آ گئے کہ کچھ سرکاری کاغذات لینے آئے تھے، فوراً واپس جا رہے ہیں۔ ابھی جانے بھی نہ پائے تھے کہ نازو آ پہنچیں اور ہم کو گھر پر دیکھ کر کہا۔

"ارے بھائی صاحب؟" میں نے تو سنا تھا کہ آپ کے متعلق تلاش گمشدہ والا اشتہار اخباروں میں نکل رہا ہے۔ پولیس والوں کو حلیہ لکھ کر دے دیا گیا ہے۔ مگر آپ تو خدا کے فضل سے موجود ہیں۔"

ہم نے کہا۔ ”یہ غالباً آپ کی کشش تھی۔ ورنہ یہاں اتنی فرصت کہاں کہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔“

نازو نے کہا۔ ”آپ کے سرکاری کام تو ہماری سرکار سے بھی بڑھ گئے۔ تو اب آپ جا کہاں رہے ہیں۔ بیٹھیے نا دو گھڑی۔ یہ اچھا طریقہ ہے کہ ”طاقتِ مہمان نہ داشت خانہ بہ مہمان گزاشت۔“

ہم نے ہنس کر کہا۔ ”اگر تم بھی اس گھر میں مہمان ہو تو لعنت ہے میرے میزبان ہونے پر۔ دوسرے آپ کی اس تشریف آوری کا احسان مجھ پر تو ہے نہیں رفو کے پاس آئی ہیں ان ہی کو شرمندۂ احسان کیجئے۔ میں اجازت چاہتا ہوں مجھے بڑے ضروری کام سے فوراً روانہ ہو جانا ہے۔“

یہ کہہ کر ہم تو باہر چلے گئے اور یہاں شروع ہو گئی کانفرنس کی کارروائی، جس کو سننے کے لیے ہم اس وقت اپنا پروگرام ملتوی کر کے یہاں آ گئے تھے۔ چنانچہ باہر جا کر ہی اس کمرے کے پشت والے کمرے میں چپکے سے آ گئے جس میں یہ دونوں بیٹھی ہمارے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے رفو کہہ رہی تھیں۔

”خیر یہ تو طے ہے کہ جاتے ہیں کلب اور وہیں سے رات کو دو ڈھائی بجے واپسی ہوتی ہے۔ چار پانچ روز تک میں نے خود دیکھا اس کے بعد اپنے ایک رشتہ کے چھوٹے بھائی عرفان سے کہا کہ وہ ذرا خبر رکھیں۔ ان کی بھی یہی اطلاع ہے کہ کلب کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتے۔“

نازو نے کہا۔ ”بڑا تیر مارا ہے آپ نے جو یہ مخبری کی۔ یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ کلب ہی میں دونوں ملتے ہیں اور سارے گل وہیں کھل رہے ہیں۔“

رفو نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں، وہ تم نے کہا تھا کہ شام کو شیلا کے یہاں چائے پیتے ہیں۔ یہ خبر یا تو غلط ہے یا اب اس کے یہاں کسی وجہ سے نہیں جاتے۔ دفتر سے سیدھے کلب جاتے ہیں اور وہاں سے سیدھے گھر آتے ہیں۔“

نازو نے کہا۔ ”ضرورت تو اس کی ہے کہ کلب کے اندر کے حالات معلوم ہوں۔“

رفو نے مایوسی کے ساتھ کہا۔ ”وہاں تک میری پہنچ بھلا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے تو کسی طرح تم فیاض صاحب سے روز کی خبریں معلوم کر لیا کرو۔ خیر جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ مگر میں چاہتی تھی کہ مجھے کم سے کم تمام حالات معلوم ہوتے رہیں۔“

نازو نے کہا۔ ”ان سے تو میں برابر پوچھتی رہتی ہوں بلکہ وہ خود مجھے بتاتے رہتے ہیں۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ خود تمھارے راز دار بن جاتے مگر قصہ دراصل میں یہ ہے کہ ان کو تمھارے ساتھ بھی ہمدردی ہے اور دوست کے راز کا بھی خیال ہے۔ وہ یہ تو کسی طرح نہیں چاہتے کہ شیلا کے ساتھ ان کی شادی ہو جائے۔ بے حد نفرت کرتے ہیں اس سے۔ کل ہی بہت برا بھلا کہہ رہے تھے کہ شوکی کہہ کہہ کر جس قدر ہو سکتا ہے بے وقوف بنا رہی ہے اور ان حضرات کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ دنیا سے منہ موڑے ہوئے بس اسی کو پوج رہے ہیں۔ سب ہنستے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں۔ آوازیں کستے ہیں۔ مگر ان کو پرواہ نہیں ہے۔ کل کہہ رہے تھے کہ میں نے بہت سمجھایا کہ دیکھو تم ناگن کو آستین میں پال رہے ہو اور یہ جو عشق کا بھوت اس پر یا تم پر سوار ہے چار دن کی چاندنی ہے۔ وہ ولایت زدہ لڑکی ہے اور اگر تم کو اس سے وفا کی امید ہے تو یہ غلط ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر رونا پڑے گا۔ اور بے زبان بیوی کا صبر ایسا پڑے گا کہ تم کو کسی کل چین نہ آئے گا۔ خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتے رہے اور آخر میں صرف اتنا کہا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے“

رفو نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ’’خیر میں نے تو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے اور بہت کچھ غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس میں دراصل ان کا قصور اتنا نہیں ہے بلکہ خود ہی مجھ میں کوئی کمی ایسی ہے کہ وہ دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ اگر مجھ ہی میں کمی نہ ہوتی تو وہ کیوں شیلا کے طرف متوجہ ہوتے۔‘‘

نازو نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ’’چلو ہٹو۔ آئی ہیں وہاں سے کمی بیشی لے کر۔ ارے اس مردذات کو نہ کمی سوجھتی ہے نہ بیشی۔ ذکیہ کو دیکھا ہے تم نے، کیسی چاند سی صورت ہے۔ ہزار دو ہزار خوبصورتوں میں ایک ہے۔ سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ جو کوئی دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے اور سنا ہے کہ ان کے میاں نے ایک، بہشتن سے شادی کر لی۔ کالی بھجنگ، موٹی تازی پہلوان جیسی معلوم ہو جیسے جبشن، نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ پڑھی نہ لکھی اور صورت شکل تو جیسی ہے، میں کہہ ہی چکی ہوں، مگر وہ اللہ کا بندہ دن رات اس کے یہاں پڑا رہتا ہے اور ذکیہ غریب جس کے لیے سب یہی کہا کرتے تھے کہ میاں پیر دھودھو کر پیے گا اپنی قسمت کو پڑی رویا کرتی ہے۔‘‘

رفو نے بہت غور سے سنتے ہوئے کہا۔ ’’ایسے موقوں پر تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔‘‘

نازو نے گویا قطعی طور پر کہا۔ ’’نہیں جی، یہ مرد ہوتے ہی گھناؤنے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ دیکھ لینا جن شیلا کے حسن کا بڑا شہرہ ہے وہ بھی ایسی کچھ نکلے گی۔‘‘

رفو نے کہا۔ ’’میرا تو خیال ہے کہ میں نے اس کو دیکھ لیا ہے۔ پرسوں جب میں کلب کی طرف سے واپس آ رہی تھی تو رکشا پر ایک عورت کلب کے پھاٹک تک آئی۔ پستہ قد، پھولے پھولے سے اجڑے ہوئے بال، سانولا رنگ، مگر اس پر ’’میک اپ‘‘ غضب کا تھا۔ ساڑھی باندھے ہوئے اور ہاتھ میں ایک بیگ لیے ہوئے۔‘‘

نازو نے کہا۔ ’’ہاں، ہاں وہی ہوگی۔ فیاض صاحب نے بھی یہی حلیہ ان

مساۃ کا بیان کیا ہے۔ اب بھلا بتاؤ کہ ایسی کون سی پری زاد ہیں۔‘‘

رفو نے کہا۔ ’’مگر مجھے شک ہے۔ اس لیے کہ شیلا کے حسن کی تو بہت تعریف سنی ہے اور یہ عورت جس کو میں نے دیکھا ہے حسن کے آس پاس بھی نظر نہیں آئی۔‘‘

نازو نے منہ چڑھا کر کہا۔ ’’چلو ہٹو حسن نہیں تو وہ۔ اگر ایسے ہی یہ مرد حق شناس ہوتے تو اپنی بدمذاقیوں کے نت نئے نمونے روز پیش نہ کرتے۔ ان لوگوں کے نہ تو سر میں دماغ ہوتا ہے، نہ چہرے پر آنکھیں، بس سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھے جس کی چاہتے ہیں قسمت پھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ذکیہ کے میاں کا قصہ سن ہی چکی ہو۔ شمیم کو بھی تم نہ دیکھا، جن کے میاں کے پاس وہ عورت تھی موٹی جیسے چھپکلی، صورت دیکھ کر متلی ہو۔ صدقہ کا کوا، لمبی تاڑ ایسی...... اور وہ یاد ہیں تم کو ڈاکٹر سہراب کی بہن کلثوم، ہائے ہائے کیسی پیاری صورت تھی۔ نازک نازک سا نقشہ، نشہ میں چور آنکھیں۔ میدے اور شہاب کا رنگ، کامنی سی صورت دیکھ کر پیار آتا تھا۔ مگر میاں کمبخت نے جلا جلا کر مار ڈالا۔ ایک عورت ڈال لی تھی جو سنا ہے کہ ان ہی کے کسی چپڑاسی کی بیوی تھی، تھوتھو۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ان مردوں سے زیادہ ناقدرا اور کون ہوگا۔ ہیرے کو ہمیشہ یہ کمبخت پتھر سے توڑتے ہیں۔ کلثوم غریب جل جل کر رہی۔ آخر دق ہوگئی اور اسی کوفت میں دنیا سے رخصت ہوگئی مگر میاں کو راہِ راست پر نہ لاسکی۔ حالانکہ سنا ہے کہ بڑے چاؤ سے شادی کی تھی۔ پہلے خط و کتابت ہوتی تھی۔ بڑا عشق بگھارا گیا تھا۔ کلثوم نے ڈاکٹر سہراب سے صاف کہہ دیا تھا کہ میری شادی ان ہی کے ساتھ کر دو۔ ایک دوسری جگہ نسبت ٹھہری ہوئی تھی، وہاں سے چھڑا کر ان کے ساتھ شادی کی گئی تھی جس کا یہ حشر ہوا۔‘‘

رفو نے سب کچھ سن کر کہا۔ ’’یہ ٹھیک ہے، مگر بہن یہ تو ایسے نہ تھے۔ کبھی میں نے ان کے متعلق اس قسم کا شبہ تک نہیں کیا۔‘‘

نازو نے جل کر کہا۔ ''بس تم یہی کہے جاؤ۔ ایسے نہیں تھے تو پھر آخر ایسے کیوں گئے۔ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے۔ یہ کہو کہ یہ مرد سب کے سب بنے بنائے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ چھپے رستم، کچھ کھلے کافر اور جوان باتوں میں نہیں ہیں وہ یا تو فرشتے ہوتے ہیں یا پھر بیمار۔''

رفو کو باوجود اس کیفیت کے ہنسی آ گئی۔ ''تمھارا مطلب یہ خدا نہ کرے میرے میاں اب تک بیمار تھے۔ اب خدا نے ان کو صحت دی ہے۔''

نازو نے اسی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو فیاض صاحب سے برابر کہا کرتی ہوں کہ یا تم بڑے ہی چالاک ہو کہ اپنی کوئی بات کھلنے نہیں دیتے یا تمھاری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ ورنہ مجھے تو کسی مرد کا ذرا سا اعتبار نہیں ہے یہ ستر ہانڈیوں کا مزہ چکھنے والے نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔''

رفو نے کہا۔ ''خیر یہ تو ہے مگر اب یہ بتاؤ کہ اندر کے حالات کیسے معلوم کیے جائیں۔ باہر باہر سراغ رسانی میں کرتی رہتی ہوں مگر کوئی خاص پتہ سوائے اس کے نہیں چلا ہے کہ وہ دفتر سے کلب جاتے ہیں اور کلب سے گھر آ جاتے ہیں۔''

نازو نے کہا۔ ''ترکیب بس یہی ہے کہ یا تو تم میرے میاں کو خود بلا کر ان کو اپنا ہم راز بنا لو۔''

رفو نے بات کاٹ کر کہا۔ ''خیر ان کو ہم دم و ہمراز بنانا تم کو ہی مبارک رہے۔''

نازو نے ہنس کر کہا۔ ''اے ہے، میرا یہ مطلب نہیں ہے، میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ یا تو وہ تم کو خبریں پہنچایا کریں یا ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی عرفان کو کلب کا ممبر بنوا دو۔''

رفو نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک تو کہتی ہو۔ عرفان دراصل میرے رشتہ کے بھائی ہیں اور میرے میاں ان کو شاید جانتے بھی نہیں ہیں۔ اسی لیے میں نے ان کو جاسوسی پر مقرر کیا تھا۔ اب ٹھیک ہے کہ میں ان کو کلب کا ممبر بنوانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم اپنے میاں سے ان کی سفارش کرا دینا۔''

اس گفتگو کے دوران میں ہی وہاں چائے آ گئی اور اب ہمارا زیادہ ٹھہرنا بھی مناسب نہ تھا لہٰذا کھسکے وہاں سے۔

(11)

عرفان ہمارے کلب کے ممبر بن چکے تھے اور فیاض کے مشورے کے مطابق اب ہم انتظاماً شیلا کے ساتھ زیادہ رہنے لگے تھے۔ سب سے الگ تھلگ کسی گوشہ میں بیٹھے شیلا کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہیں اور وہ سر کھا رہی ہے۔ ایسی عقل مند جو اقبال کے حکیم ہونے کا مطلب بنفشہ اور خطمی والی حکمت سمجھ لے کسی قسم کی گفتگو کے قابل نہیں ہو سکتی مگر فیاض کا حکم یہی تھا کہ ابدی مسرت حاصل کرنے کے لیے یہ وقتی کوفت برداشت کریں۔ فیاض کا فیصلہ یہ تھا کہ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ عرفان کے ذریعے بیگم تک شیلا کے قصے پہنچتے رہیں گے، دوسرے شیلا سے چھٹکارے کی صورت بھی یہی ہے کہ اس سے بھاگنے کی بجائے اس سے گھل مل کر رہنے کی کوشش کی جائے اور جب قطعی طور پر یہ طے کر لیا جائے کہ اب شیلا سے کوئی سروکار رکھنا نہیں ہے۔ بس اسی دن اظہار عشق کر دیا جائے جس کا نتیجہ وہی ہوگا جو رمیش کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ ادھر تو ہم شیلا کے ساتھ رہتے تھے، ادھر عرفان صاحب باقی ممبروں کے لیے عجیب تفریح کا سامان بنے ہوئے تھے۔ بے چارے مولوی قسم کے آدمی، تازہ تازہ گریجویٹ، حال ہی میں نہر کے محکمہ میں نہ جانے کن صاحب کی عقل مندی سے آپ کو ایک معقول رقم کا عہدہ مل گیا تھا۔ نہ آدمیوں میں اب تک بیٹھے تھے، نہ سوسائٹی کے آداب سے واقف تھے۔ کالج میں بھی دیمک کی قسم کے طلباء میں سے تھے جن کا مقصد سوائے کتابوں کے چاٹنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ آدمی تھوڑے ہوتے ہیں۔ امتحان پاس کرنے کی مشین ہیں کہ ان کو امتحان کے کمرے میں بٹھا کر پرچہ دے دیجئے۔ یہ سوالات حل کر کے نمبر لینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کسی سے بات کرنے کے قابل، نہ دنیا کے کسی معاملہ سے ان کو سروکار۔ بھلا یہ بے چارے کیا جانیں کہ کلب میں کیا ہوتا ہے۔

یہ بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

تاش کے کھیلوں میں کبھی کبھی غلام چور یا زیادہ سے زیادہ ترپ کھیلا ہوگا حالانکہ آج کل تاش کے تمام نئے کھیل کالجوں کے ہوسٹل سے نکلتے ہیں۔ مگر یہ بے چارے تو محض طالب علم تھے۔ کالج جاتے تھے کہ پڑھیں اور آتے تھے کہ کالج میں جو کچھ پڑھا ہے اس کو یاد کریں۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ قسمت میں کلب کی ممبری بھی لکھی ہوئی ہے۔ مگر بہن کی ہمدردی سے مجبور تھے کہ یہ بدعت بھی گوارا کر لی۔ مگر اب حال یہ تھا کہ کلب میں ہر چیز سے بھڑکتے تھے۔ کوئی آپ سے بات کرے تو آپ کسی دوسرے کی آڑ میں آ جاتے۔ تاش کھیلنے کو کہا جائے تو انگوٹھا چوسنے لگیں۔ شعر و شاعری کی بات ہو تو گم صم بیٹھے رہیں۔ سوال یہ تھا کہ پھر آپ نے کلب کو کیوں نوازا ہے۔ اس کا جواب خود آپ کے پاس بھی نہ تھا۔ رمیش اور اخلاق ان کو بے حد تنگ کیا کرتے تھے۔ غالباً فیاض نے رمیش اور اخلاق سے یہ تمام قصہ کہہ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج کل جہاں شیلا کے ساتھ ہم کسی طرف گئے عرفان کے سامنے یہ سب مل کر ہمارے اس رومان کا ایسا ذکر چھیڑتے تھے کہ گویا بس ہم دونوں کی آج ہی کل میں شادی ہونے والی ہے۔ عرفان اس گفتگو کو نہایت دلچسپی سے سنتے تھے اور صرف یہ مبحث ایسا تھا کہ وہ کبھی کبھی ایک آدھ سوال کر لیا کرتے تھے۔ خواہ وہ کیسا ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔ شیلا سے آپ بے حد جلتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ گویا آپ کی ہمشیرہ محترمہ کی سوت ہونے والی تھی۔ دوسرے شیلا ان کو چھیڑتی بھی بہت تھی۔ آج اس نے ان حضرت کو گھیر کر اصرار شروع کر دیا کہ آیئے تاش کھیلئے۔

عرفان نے جب کہا مجھے کھیل آتا ہی نہیں تو اس نے کہا۔

"کوئی مشکل کھیل نہیں، میں تھوڑی ہی دیر میں سکھا دوں گی۔"

عرفان صاحب نے ایک طرف سمٹتے ہوئے کہا۔ "کون سی اچھی بات ہے جو سیکھی جائے۔"

شیلا نے کہا۔ "اچھا تو پھر ہم دونوں گڑیاں کھیلا کریں یہاں۔"

عرفان تو شرما کر چپ ہو گئے اور باقی لوگ ہنس دیئے۔ اخلاق نے کہا۔

"واقعی عرفان صاحب ہم لوگ بے حد شرمندہ ہوتے ہیں کہ آخر آپ کے لیے دلچسپی کا کیا سامان مہیا کریں۔ تاش آپ کھیلتے نہیں، بلیئرڈ ٹیبل پر آپ نہیں جاتے، ٹینس سے آپ کو دلچسپی نہیں۔ اگر کسی خاص کھیل یا کسی خاص تفریح کی ضرورت ہو تو فرما دیجئے نا۔"

عرفان نے پہلے تو جواب دینا ہی نہ چاہا، اس کے بعد بمشکل تمام کہا۔ "جی نہیں۔ بس کافی ہے۔"

شیلا نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب ہوا آپ کا۔ کیا چیز کافی ہے۔"

اخلاق نے کہا۔ "آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ آپ کے لیے فی الحال یہی کافی ہے کہ آپ دوسروں کی دلچسپیوں کو دیکھتے رہیں۔ دلچسپی حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔"

عرفان نے جلدی سے کہا۔ "جی نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ خیر کچھ نہیں۔"

رمیش نے کہا۔ "آخر اس میں شرم کی کون سی بات ہے کہہ دیجئے نا، اب آپ کی عمر شرمانے لجانے کی تو ہے نہیں۔ ماشاءاللہ خود سمجھ دار ہیں۔ اپنی برائی بھلائی کو سمجھ سکتے ہیں۔"

فیاض نے کہا۔ "ہاں۔ ہاں یعنی ماشاءاللہ عاقل بالغ نہیں۔"

عرفان کا شرم کی وجہ سے یا غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ ہمت کر کے نہ جانے کیا کہنا چاہا مگر کہا صرف یہ کہ "میں تاش واش کھیلنا پسند نہیں کرتا۔"

شیلا نے کہا۔ "یہ تو معلوم ہوا مگر سوال یہ ہے کہ پھر آپ پسند کیا کرتے ہیں۔"

رمیش نے کہا۔ "خیر آپ یہ بات نہ پوچھئے۔ نہ معلوم کیا کہہ بیٹھیں۔"

اس پر سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی تو اخلاق نے کہا۔ "آخر آپ حضرات کو عرفان صاحب کی دلچسپی کی ایسی کھوج کیوں ہے، ہر شخص ذاتی طور پر اپنی دلچسپی حاصل کرنے کے طریقے جانتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "طریقوں سے بحث نہیں لیکن اگر دلچسپی کا پتہ چل جاتا تو اچھا تھا۔"

شیلا نے کہا۔ "ہاں تاکہ ہم لوگ بھی آپ کی دلچسپی میں حصہ لے سکتے۔"

فیاض نے کہا۔ "جی نہیں۔ بہت سی دلچسپیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں کسی اور کا حصہ لینا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔"

رمیش نے کہا۔ "مثلاً۔"

فیاض نے کہا۔ "آپ ہی شوکی و شیلا کے روابط دیکھیں، ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔"

شیلا نے چلبلا کر کہا۔ "مسٹر فیاض اب آپ ذاتیات پر آ رہے ہیں۔ شوکی میرا دوست ہے۔ اور میں آزاد ہوں کہ اپنے دوست کے ساتھ دوستی کروں۔ اس میں کسی کو شکایت کا کیا موقع ہے۔"

فیاض نے کہا۔ "کسی اور کو تو کیا آپ ہی کو شکایت پیدا ہو گئی۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ ان کی دلچسپی میں حصہ لینے پر کیوں مصر ہیں۔"

شیلا نے کہا۔ ”کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ اگر عرفان صاحب خود حصہ دیں گے تو لے لیا جائے گا، ورنہ ان کو اختیار ہے۔ ہمارا کیا اجارہ۔“

عرفان نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ ”میری دلچسپی یہی ہے کہ میں آپ سب کی دلچسپیاں دیکھتا رہا ہوں۔“

اخلاق نے کہا۔ ”کیا خوب شعر کہا آپ نے۔

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

رمیش نے عرفان کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ ”اچھا یہ بتایئے عرفان صاحب کہ آپ کو کبھی کسی سے عشق ہوا ہے۔“

اس بے تکلف سوال پر سب کو ہنسی آ گئی اور عرفان واقعی لڑکیوں کی طرح شرما کر فیاض کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ شیلا نے رمیش کو گویا ڈانٹا۔ ”یہ کیا بے ہودہ سوال ہے۔ وہ بے چارے یہ باتیں کیا جانیں۔ ان کی تربیت آپ کی طرح نہیں ہوئی ہے کہ جسے دیکھئے مجنوں فرہاد بنا پھر رہا ہے۔“

رمیش نے کہا۔ ”معاف کیجئے گا مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی تربیت میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔“

اب پھر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور عرفان نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو اخلاق نے ان کو روکا۔ ”یہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ ارے بھئی تم تو واقعی لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو۔ آخر یہ کیا حرکت ہے۔ پڑھ لکھ کر کالج سے نکل آئے، سرکاری عہدیدار ہوئے اور یہ حال ہے۔“

شیلا نے کہا۔ ”تو سرکاری عہدیدار کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ عشق بھی کرتا پھرے۔

رمیش نے کہا۔ ”مگر یہ تو گویا ضروری ہے کہ وہ لڑکیوں کی طرح بات بات پر دوپٹہ سے منہ چھپا لے۔ لجا جائے۔ شرم سے بل کھا جائے۔“

اخلاق نے عرفان کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ کو چاہیے کہ یہ بچپن چھوڑیں اور ایک ذمہ دار انسان کی طرح ذرا رکھ رکھاؤ سے رہیں۔ اگر آپ کا یہی حال ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو کیونکر پورا کرتے ہوں گے۔ اس طرح تو آپ کے ماتحت آپ کو انگلیوں پر نچا کر رکھ دیں گے اور آپ کے حکام آپ کے متعلق نہ جانے کیا رائے قائم کرتے ہوں گے۔“

عرفان نے اخلاق کو واقعی ناصح مشفق سمجھ کر کہا۔ ”جی ہاں مگر......“

رمیش نے کہا۔ ”مگر شرم آتی ہے۔“

شیلا نے ڈانٹا۔ ”یہ کیا حرکت ہے رمیش صاحب آپ کی، وہ بے چارہ ایک سیدھا سادا آدمی ہے تو آپ اس کو مسلسل چھیڑ رہے ہیں۔“

رمیش نے کہا۔ ”لیجئے حضرات۔ خط پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ڈاکٹر شیلا کی اس طرف داری کو میرا تجربہ سونگھ رہا ہے اور ”بوئے وفا می آید۔“

سب لوگ ہنس دیئے۔ مگر شیلا نے پھر ڈانٹا۔ ”رمیش تم واقعی پاگل ہوتے جا رہے ہو میں نے تم سے ہزار مرتبہ کہہ دیا ہے کہ تم کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے تو خاموش رہا کرو۔“

رمیش تو شیلا کے سلسلہ میں بے غیرت ہو ہی چکے تھے فوراً بولے۔ ”میں اس لیے خاموش نہیں رہتا کہ پھر اس رہے سہے سلیقہ میں بھی زنگ لگ جائے گا۔“

اخلاق نے بدستور عرفان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آخر آپ کو دنیا کے کس مشغلہ سے دلچسپی ہے۔ کبھی کوئی کھیل کھیلا ہے۔“

عرفان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، مجھے کچھ دلچسپی شکار سے رہی ہے۔“

فیاض نے کہا۔ ”خیر اس سے تو آپ ہم جانوروں کو محفوظ رکھئے گا اور

فرمائیے۔“

عرفان نے کہا۔ ”اور کبھی کبھی شطرنج کھیل لیا کرتا تھا۔“

شیلا نے گویا اچھل کر کہا۔ ”اوہ شطرنج I love it مجھے بے حد پسند ہے۔ اخلاق واقعی شطرنج کا انتظام کر دو۔ میں عرفان کے ساتھ کھیلا کروں گی۔“

اخلاق نے کہا۔ ”بہتر ہے۔ شطرنج کا انتظام ہو جائے گا مگر اب میں آپ کو رائے دوں گا کہ آپ کبھی کبھی تاشوں سے بھی دل بہلا لیا کیجئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپس میں ہنسا بھی کیجئے۔ یہ آپ کی شرم و حیا خواہ کیسی ہی شریفانہ کیوں نہ ہو مگر آپ پھر بھی مرد ہیں۔“

رمیش نے ہنسی کے مارے لوٹ کر کہا۔ پھر بھی داد نہیں دی جا سکتی۔ آپ پھر بھی مرد ہیں۔“

اس موقع پر شیلا کو بھی ہنسی آ گئی اور اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔ ”یہ رمیش واقعی پاگل ہونے والا ہے۔ نہایت خطرناک آثار ہیں۔ ذرا دیکھئے تو سہی کیسا پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے۔“

رمیش نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے آپ نے پھر مجھ سے اس لب و لہجہ میں گفتگو کی جس سے مجھ کو کچھ محبت کی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔“

شیلا نے کہا۔ ”غلط فہمی کیا یہ تو واقعہ ہے۔ محبت تو میں اب بھی تم سے کرتی ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دعا کرتی رہتی ہوں کہ کہیں تم نہ محبت کرنے لگو۔“

اخلاق نے عرفان کی طرف پھر توجہ کی۔ ”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا جناب عرفان کہ آپ کلب کے ممبر بنے ہیں تو کلب کی دلچسپیوں میں حصہ لیں۔ ایک تو یہ کلب یونہی خشک قسم کا کلب ہے۔ یہاں کی پہلی شرط یہ ہے کہ شراب پینے والے کلب کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس کلب کو کوئی خانقاہ کہتا ہے، کسی نے گرلز اسکول کا نام رکھا ہے۔ کوئی

اس کو پرورش گاہ زچگان و بچگان کہتا ہے۔ سول سروس کلب والے اس کو یتیم خانہ کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ محض شراب کا بار نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر نام رکھے جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر آپ کی طرح چند ممبر اور بھی ہو گئے تو شاید اس کلب کا نام حرم سرائے ہو جائے۔ آج مہربانی فرما کر تاش کا کھیل سیکھئے اور ذرا منہ سے بولا کیجئے نا۔“

رمیش نے کہا۔ ”اب تو آپ کو کئی دن ہو چکے۔ آخر یہ شرم و حیا تو نئی نویلی دلہنیں بھی چند دن کے بعد چھوڑ دیتی ہیں۔“

اخلاق نے تاشوں کا پیکٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”بس اب ہو چکی شرم، آج ہی آپ بسم اللہ کیجئے۔ انشاء اللہ چند دن کے بعد آپ ہی ہمارے کلب کے سب سے بڑے تاش کھیلنے والے ممبر ہوں گے۔“

عرفان کچھ ہچکچائے کچھ انکار کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر جب اخلاق نے ان کو رمی کا سبق دینا شروع کیا تو نہایت سعادت مندی کے ساتھ بیٹھ کر سمجھنے بھی لگے۔ اخلاق نے پہلے تو ان کو سمجھایا کہ اس طرح اس میں پتے بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح پتے پھینکے جاتے ہیں۔ اور اس طرح دوسروں کے پھینکے ہوئے پتوں کو دیکھا جاتا ہے، اور یہ احتیاطیں برتی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کہا اب آپ دیکھئے ایک آدھ کھیل ہم کھیلتے ہیں۔ پھر آپ کا امتحان لیا جائے گا۔ وہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ دیکھنے لگے اور کھیل شروع ہو گیا۔

(۱۲)

خدا بچائے اس کمبخت فیاض سے، نہ جانے کس وقت وہ باتیں سوچا کرتا تھا جو کم از کم ہماری سمجھ میں تو آ نہیں سکتیں۔ بیٹھے بٹھائے کہنے لگا ایک دن کہ سنا ہے تم نے وہ مصرعہ ؎

شکار کھیلنے آئے شکار ہو کے چلے"

ہم نے تعجب سے کہا۔ ''کیا مطلب؟''

کہنے لگا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کے جو یہ سالے صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ہیں نا عرفان صاحب، ان کا کیا بندوبست کیا جائے۔''

ہم نے اور بھی تعجب سے کہا۔ ''کیسا بندوبست۔ آخر آپ پہیلیاں کیوں بجھا رہے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ کیا بات ہے۔''

ہم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بھئی وہ تمھارے لیے تعینات کیا گیا ہے نا، تمھاری بیوی کی طرف سے تمھاری جاسوسی کرنے کے لیے۔''

ہم نے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہاں تو پھر؟''

فیاض نے کہا۔ ''پھر یہ کہ اس کو بھی تو کچھ سزا یا جزا ملنا چاہیے۔ خیر جزا دینے والا تو خدا ہے۔ مگر کچھ نہ کچھ مزا تو ہم کو بھی چکھانا چاہیے۔

ہم نے بدستور تعجب سے کہا۔ ''تو کیا کرنے والے ہیں آپ اس غریب کے ساتھ۔''

فیاض نے کہا۔ ''ارادے تو بہت کچھ ہیں مگر انسان کا ہر ارادہ پورا نہیں ہوا کرتا۔ فی الحال تو خیال یہ ہے کہ کیوں نہ اس کو شیلا کے عشق میں مبتلا کر دیا جائے۔ وہ حضرت نماز بخشوانے آئے ہیں روزے ان کے گلے میں ڈال دیئے جائیں۔ پھر یاد کریں گے عمر بھر بچے اور معنی۔''

ہم نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یار ہے تو بڑی دلچسپ ترکیب اور تمھاری معمولی سے معمولی ترکیب وہ خطرناک رنگ لاتی ہے کہ میں کیا کہوں۔''

فیاض نے بڑے انہماک کے ساتھ کہا۔ ''اب صرف مجھے یہ سوچنا ہے کہ اگر عرفان کو شیلا کی طرف روانہ کیے دیتا ہوں تو اس کا کوئی اثر اصل معاملہ پر تو نہیں پڑتا۔ یعنی اگر وہ عشق میں مبتلا ہو گئے تو ظاہر ہے کہ سراغرسانی اور جاسوسی کے کمالات ذرا کم و بیش کر سکیں گے۔ حالانکہ اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ یہ حضرت اپنی ہمشیرہ صاحبہ کو روز رپورٹ برابر پہنچاتے رہیں تاکہ ہماری کھچڑی اسی رفتار سے پکتی رہے جس رفتار سے پک رہی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''یار ایک بات بتاؤ کہ یہ کھچڑی تم کب تک پکاؤ گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر رفو کو اس وقت معلوم ہو جائے کہ میں محض تاش کھیلتا ہوں اور باقی تمام باتیں غلط ہیں تو وہ نہایت خوشی کے ساتھ تاش کھیلنے کی اجازت دے دیں گی۔''

فیاض نے دانت پیس کر کہا۔ ''گھامڑ، گاؤدی! یار تم میرے سامنے سے دور ہو جاؤ سخت غصہ آ رہا ہے۔ نہ ہوئے تم میری اولاد، خدا کی قسم اتنا مارتا کہ آئندہ کے لیے ساری نسل گنجی ہو جاتی۔ ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بھائی جب تمھاری سمجھ میں ایک بات آ ہی نہیں سکتی تو بلاوجہ ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ تم دراصل ان سیاسی گتھیوں کو سلجھا ہی نہیں سکتے۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے دماغ کی۔ تمھارے دماغ میں ایک تو پہلے ہی گھاس بھری ہوئی تھی اور اس کو بھی اہلیہ محترمہ اس حد تک چر گئی ہیں کہ اب سے

کسی سمجھ داری کی توقع کم از کم مجھ کو تو ہو نہیں سکتی۔“

ہم نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال یہ تھا کہ اب انکشافِ راز کا وقت آچکا ہے۔“

غصہ سے دانت پیس کر بولا۔ ”آپ کا خیال خام، آپ کی عقل فاتر اور آپ ذاتی طور پر چغد۔ یہ آخری مرتبہ سمجھا رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہی اسکیم آپ کے گلے اس بری طرح پڑے گی کہ پھر قیامت تک صفائیاں پیش کرتے رہیں مگر گلو خلاصی نہ ہوگا۔“

ہم نے فیاض کی خطرناکیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ میں تمھاری حرکتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ اسی مذاق کو سنجیدہ بنا کر میری زندگی کو دشوار کر سکتے ہو۔“

فیاض نے پھر اپنی نارمل حالت پر آ کر کہا۔ ”بس تو پھر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو محض غور سے سنا کرو۔ اپنی زنگ خوردہ عقل کو بیچ میں لانے کی کوشش کبھی نہ کرو۔ اور اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ تم نے اگر میرے مشورے کے بغیر دانستہ یا نادانستہ طور پر کبھی اس راز کو کھولنے کی کوشش کی تو میں تمھارا ستیاناس مار کر رکھ دوں گا۔ ایسی جگہ ماروں گا جہاں پانی بھی نہ ملے، اور وہی جو آپ کی بیگم صاحبہ ہیں نا جن کو مارے عقیدت کے آپ بیوی سمجھتے ہیں آپ کے لیے موت کے فرشتہ کا کام دے گی۔“

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”درسِ عبرت ہو چکا بابا، صدق دل سے توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ”چرا“ تو کیا معنی ”چوں“ بھی نہ کروں گا۔ آپ اپنی اسکیم بیان فرمائیے۔“

فیاض نے پھر اپنے اوپر وہی لیڈروں والا تدبر اور تفکر طاری کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ دانتوں میں انگلی دبائی۔ کچھ منہ ٹیڑھا کیا۔ ایک آدھ مرتبہ

ہاتھ چلائے اور پھر اس طرح کہنا شروع کیا گویا آپ پر الہام ہو رہا ہے۔ ”قصہ اصل میں یہ ہے کہ جو تمھارا سالہ ہے نا عرفان، اس کے آس پاس آٹھ آٹھ میل تک عشق کے جراثیم نظر نہیں آتے۔ عشق کرنے والوں میں جو ایک خاص قسم کی چغدیت ہوتی ہے وہ تو خیر اس میں پیدائشی طور پر ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اربابِ عشق میں ایک خاص قسم کی صلاحیت بھی ہونا چاہیے۔ اس کا ان کے یہاں ذکر نہیں۔ عشق کے فلسفے کو میرے خیال میں تم خود بھی نہیں سمجھتے ہو۔ یہ کچھ الیکٹری سٹی (Electricity) کے قسم کی چیز ہے۔ یعنی نگیٹو (Negative) اور پازیٹیو (Positive) دو قسم کے تاروں کا ملنا کرنٹ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح عشق کے لیے صلاحیت اور حماقت دونوں کا بیک وقت ہونا ضروری ہے۔ اگر حماقت ہی حماقت ہے تو آدمی بے وقوف بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر صلاحیت ہی صلاحیت ہے تو آدمی پڑھ لکھ کر وکیل یا بیرسٹر ہو جاتا ہے اور نہ پڑھ سکا تو پولیس میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں خصوصیات بحصہ مساوی موجود ہیں تو اس کا عاشق ہونا برحق ہے۔ آپ کے ان سالے صاحب کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ جس آسانی سے آپ کے سالے بن گئے ہیں۔ اسی قدر مشکل کے ساتھ کسی کو اپنا سالہ بنانے کے لیے جس جوہر ذاتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ”کنٹرول ریٹ“ پر تو کیا معنی ”بلیک مارکیٹ“ میں بھی نہیں مل سکتا۔“

ہم نے اس مجذوبانہ بڑ سے عاجز آ کر عاجزی کے ساتھ کہا۔ ”خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کرو۔ تم اپنی قابلیت بگھار رہے ہو اور میرا دم نکلا ہوا ہے۔“

ایک دم سے برستے ہوئے بولے۔ ”قابلیت بگھار رہے ہو کیا معنی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے جناب والا کہ آپ کا یہی خاکسار اپنے نو دوستوں کو خانماں برباد کر چکا ہے۔ ذرا سے چٹکلے میں میاں بیوی کے درمیان طلاق تک نوبت پہنچ جانا کوئی

بات نہیں۔ آپ کو اگر ذرا بھی شک ہو تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ امتحان کر کے دیکھ لیجئے۔ نہ بھابی کی طرف سے روٹی کپڑے کا دعویٰ کرایا ہو تو نام بدل دیں۔ مہر کے سلسلہ میں پھر مجھ ہی کو مصیبت پڑے گی تم مجھ ہی سے روپیہ؛ انتظام کرنے کے لیے کہو گے۔"

ہم نے اپنی جان سے بیزار ہو کر کہا۔ "تم اپنی اسکیم بتاؤ گے یا دہلا دہلا کر مار ڈالنے کا ارادہ ہے۔"

پھر متفکرانہ انداز سے بیٹھ کر آپ نے سگار سلگایا اور دیا سلائی سے کان کھجاتے ہوئے بولے۔ "ہاں تو بس مجھ کو ایک یہی فکر ہے کہ حماقت اور صلاحیت کا توازن کیونکر برابر کروں۔ بہر حال شیلا کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی طرف نہایت آسانی سے اپنا دل اچھال سکتی ہے۔ یہ آثار کچھ امید افزا ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ آپ کے سالے صاحب کو فی الحال بالکل نہ چھیڑا جائے بلکہ شیلا ہی کو اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ ان کے عشق میں وفات پانا شروع کر دے۔ خدا کی ذات سے امید تو یہ ہے کہ اگر یہ صاحبزادے جیسا کہ تم کہتے ہو واقعی بالغ ہو چکے ہیں تو ان پر ضرور اثر ہونا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر اللہ مالک ہے۔ اثر پیدا کرائیں گے۔ ہم ذاتی طور پر تو بہت کم عاشق ہوئے ہیں۔ مگر خدا جھوٹ نہ بلائے انھیں ہاتھوں سے سینکڑوں عاشق نکل چکے ہیں۔ بھان متی صاحب قبلہ ہمارے خاص بزرگوں میں سے گزرے ہیں۔ جن کے متعلق آپ نے سنا ہوگا کہ "کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا بھان متی نے ناطہ جوڑا۔" تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں میں عشق کی روح پھونکنا کچھ ایسا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ شیلا عشق کے سلسلے میں کچھ ایورریڈی (Ever ready) قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ لکھنؤ میں ایک حقہ ہوتا ہے جس کو ٹکسالی زبان میں ہردم تازہ کہتے ہیں۔ شیلا دراصل اسی حقے کی قسم کی ایک مخلوق ہیں اگر آپ کے ان سالے صاحب نے کچھ دن بھی کلب کی ان سخت گیریوں کو برداشت کر لیا جس میں وہ آج کل مبتلا ہیں تو پھر بچ کر جاتے کہاں ہیں۔ اس تمام صورت حال کے لیے وقت اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ آپ نے اگر جلد بازی سے کام لینے کی کوشش کی تو میری یہ عظیم الشان اسکیم میرا تو کچھ بگاڑے گی نہیں، آپ ہی کو لے کر ڈوب جائے گی۔"

ہم نے نہایت عقیدت مندی کے ساتھ کہا۔ "مرشد میں تو اپنی قسمت آپ کے سپرد کر ہی چکا ہوں۔ البتہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ مرنے سے کچھ دیر پہلے میرے اور بیوی کے درمیان صفائی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

اسی سنجیدگی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ "ہاں چونکہ تم سطحی انسان ہو اس لیے تمھاری یہ خواہش ہے، اگر ذرا بھی گہرائی میں جاتے تو کبھی زندگی میں صفائی کرنے کی تمنا نہ کرتے۔ ذرا تصور کرو اس وقت کا جب تم انشاء اللہ مرو گے اور یکا یک تمھاری بیوی کو خبر ہوگی کہ ان کے مرحوم شوہر کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں وہ کس قدر غلط تھیں تو وہ کس قدر تڑپ تڑپ کر روئیں گی۔ ایک ایک سے بیان کریں گی کہ ہائے مرتے دم تک اپنی خوبیاں چھپائیں۔ اپنی پاک بازیاں کبھی نہ کھلنے دیں۔ اپنی نیکیوں پر ہمیشہ پردہ ڈالا۔ سننے والے سنیں گے اور کہیں گے کہ جنتی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسی سلسلے میں تمھارا عرس ہونے لگے۔ قوالیاں ہوں۔ چادریں چڑھیں۔ گاگریں اٹھیں اور عورتیں اپنے بدمعاش شوہروں کو تمھاری قبر کی خاک تبرک سمجھ کر چٹایا کریں۔ منتیں مانیں کہ "یا موہر شاہ" اگر میرا میاں راہِ راست پر آگیا تو میں نواڑی کے پھولوں کی چادر اور تیل اور گڑ کے گلگلے نہایت بھیا نک آواز کے قوالوں کے ساتھ آپ کے مزار تک لاؤں گی۔"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مسخرے اب اپنا یہ سوانگ ختم بھی کرے گا یا نہیں۔

میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اپنی اسکیم کو اتنا نہ پھیلاؤ کہ سمٹنے میں مدت لگ جائے۔"

بے پروائی سے منہ چڑھا کر بولے۔ "کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو اپنے ہاتھ کا کام ہے۔ جہاں پر کہو قصہ ختم کر دیا جائے۔ مگر میں چاہتا تھا کہ یہ جو ضمنی دلچسپیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو ضرور پروان چڑھایا جائے۔ مثلاً یہ بہت ضروری ہے کہ عرفان اور شیلا کو اس لپیٹ میں لا کر ٹھکانے لگایا جائے۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں ہاں تو دلچسپیاں بھی قائم رکھو اور حالات کو بھی قابو سے باہر نہ ہونے دو۔"

اپنی چھڑی اٹھا کر زمین پر مرغ کی تصویر بناتے ہوئے بولے۔ "ان تمام باتوں کی فکر مجھے کچھ آپ سے زیادہ ہی ہے کم نہیں۔ آپ تو اہل غرض ہیں اس لیے اندھا ہونا ضروری ہے، لیکن میں اس کو اپنا فن سمجھتا ہوں اور کوئی فن کار اپنے فن کے سلسلے میں تضیع اوقات یا اپنی فنی صلاحیت کی بربادی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بہر صورت آپ خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھتے رہیے۔ میں کل ہی کیوپڈ کے ترکش کا ایک تیر عرفان کے لیے ضائع کروں گا۔ اچھا بھائی اب تم گھر جاؤ اور میں نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی اسکیم پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ کسی بے وقوف آدمی کی موجودگی میں کسی مدبرانہ اسکیم پر غور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ تشریف لے جائیے۔"

(۱۳)

عرفان صاحب ہمارے یہاں کس وقت جاتے تھے، کس وقت اپنی بہن صاحبہ کو رپورٹ دیتے تھے اور کس وقت ہمارے خلاف سازشیں ہوتی تھیں یہ تمام باتیں بظاہر ہم سے بہت چھپائی جاتی تھیں مگر ہم بھی بہر حال تاک میں تو تھے ہی۔ عرفان غالباً یہ سمجھتے تھے کہ صرف وہ اپنے دفتر سے رخصت پر ہیں۔ حالانکہ ہم بھی دفتر بس اسی حد تک جاتے تھے کہ گھر سے نکلے دفتر جانے کے لیے اور گھوم کر اس کمرے میں وہاں جا بیٹھے، جہاں سے ناز و اور رفو کی گفتگو سن چکے تھے۔ آج بھی گویا ہمارے دفتر جاتے ہی عرفان صاحب تشریف لے آئے۔ ان کی بہن صاحبہ تو سراپا انتظار ہی تھیں۔ ان کے دیکھتے ہی گویا کھل گئیں۔ عرفان نے آتے ہی پوچھا۔ "بھائی صاحب گئے دفتر؟"

بیگم نے کروشیا سے ہرن کا سینگ بناتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں تشریف لے گئے۔ دفتر بھی وہ معلوم نہیں کس مجبوری سے جاتے ہیں۔ اگر گھر پر ٹیلیفون لگا دیا جائے تو شاید دفتر بھی تشریف نہ لے جائیں خیر تم اپنی کہو۔ کچھ پتہ چلا کہ یہ شادی کب تک ہو رہی ہے۔"

عرفان نے رومال سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔ "آپا میں سچ کہتا ہوں ایک ہی چھٹی ہوئی ہے یہ عورت بھی۔ جتنی وہ اوپر نظر آتی ہے اس کی دگنی شاید زمین کے نیچے ہے۔ کلب کے جتنے ممبر ہیں سب کو انگلیوں پر نچا کر رکھ دیتی ہے۔ غضب خدا

کا، مجھے بھی آپ چھیڑنا چاہتی ہیں۔ منہ جھاڑ سر پہاڑ، نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ شریف بہو بیٹیوں کے ڈھنگ۔ بس صورت دیکھ کے تو میں آپ سے سچ کہتا ہوں یہ حال ہوتا ہے جیسے چائے کی پیالی میں مکھی پڑ گئی ہو۔ مگر ہمارے بھائی صاحب کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ جب دیکھئے اس کی دم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کل فالسی رنگ کی بنارسی ساڑھی باندھے ہوئے آپ تشریف لائیں اور چہرے کے اوپر اس بلا کا پوڈر تھپا ہوا تھا جیسے خمیری روٹی میں پھپھوند لگ گئی ہو۔ مگر ٹھسا ایسا تھا کہ اے سبحان اللہ! معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سب کو مار ہی تو ڈالیں گی۔ بھائی صاحب نے پہلے تو نظروں ہی نظروں میں ان کی بلائیں لیں اس کے بعد بھی جب ضبط نہ ہو سکا تو سب کے سامنے کہہ دیا۔ ''شیلا بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔'' اور اس کمبخت کو دیکھئے کہ بجائے شرمانے کے آپ انگریزی میں فرماتی ہیں:

"No Really" خدا کی قسم ہر ایک ان کی زبان پر ہنستا ہے۔ مگر ان کو کسی کی پرواہ تھوڑی ہے۔ کھلے بندوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ادھر سے ادھر پھرا کرتی ہیں۔ ارے صاحب میں آپ سے کیا کہوں، کل ان مساۃ کو ایسی ایسی قسمیں دے کر آئس کریم کھلائی کہ آپ کی تو عمر بھر اتنی خوشامد نہ کی ہوگی۔''

بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میری خوشامد کیوں کرتے بھیا، میں بھی کوئی سوسائٹی کی بٹر فلائی ہوتی۔ یا اللہ نہ کرے میری بھی وہی حالت ہوتی جو شیلا کی ہے کہ آج اس کے ہاتھ، کل اس کے ہاتھ میں ہاتھ۔ تو میری بھی قدر کی جاتی۔ مگر میں تو ان کی خدمت کے لیے دی گئی ہوں نا، میرا کام تو صرف یہ ہے کہ ان کی عزت آبرو لیے بیٹھی رہوں اور وہ اپنی شرافت اچھالتے پھریں۔''

عرفان صاحب نے گویا اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے لیے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے۔''

بیگم نے جل کر کہا۔ ''شیلا بھی تو ماں، بہن، بیٹیوں میں سے ہے۔''

عرفان صاحب نے پھر مصرعہ پڑھا بلکہ اب کی فارسی جھاڑی ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ہم خاموشی سے یہ سن رہے تھے۔ اور حیرت بھی کر رہے تھے کہ یہ عرفان جو بظاہر گونگا بھی نظر آتا ہے اور بے وقوف بھی، کس قدر باتونی ہے۔ بے وقوفی تو خیر اس وقت کی گفتگو سے بھی ظاہر تھی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ راز بھی کھل رہا تھا کہ حضرت اللہ کے فضل سے مفسد بھی ہیں۔ مثلاً فالسئی رنگ کی ساڑی دیکھ کر ہمارے متعلق تعریف کرنے والی روایت سر سے پیر تک غلط تھی۔ آئس کریم کھلانے کے سلسلے میں خوشامد کرنے والا قصہ نہایت سفید قسم کا جھوٹ تھا۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ کمرے سے نکل کر ذرا ان صاحبزادے سے پوچھوں تو سہی کہ کیوں بے دروغ باف! یہ کیا حرکت! مگر پھر خیال آیا کہ اس قسم کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد لوگ اپنی کارگذاری اسی طرح دکھا سکتے ہیں۔ دوسرے ان روایتوں سے ہماری اسکیم گویا اور بھی کامیاب ہو رہی تھی۔ بیگم کو صرف یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ آخر شادی کی روایت کس حد تک ٹھیک ہے اور اگر شادی ہونے والی ہے تو کب تک، اور یہ حضرت زیب داستان کے لیے کچھ اور فرضی نمک مرچ لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ کلب میں جا کر مجھے سانپ سونگھ جاتا ہے۔ غیر مردوں کے سامنے شرما کر رہ جاتا ہوں۔ ان کو تو اپنی قابلیت کا سکہ بہر حال بٹھانا تھا۔ وہ تو خیر مسلم الثبوت احمق تھے مگر بیگم صاحبہ کی حماقت میں مجھے کوئی شک نہ تھا، جن کی نظر انتخاب ان عقلِ کل پر پڑی۔ ملاحظہ فرمایئے اپنی بہن کے سامنے باقاعدہ ایکٹنگ کے ساتھ فرما رہے تھے۔ ''ارے آپا تمھاری قسم، ایک سے ایک بے حیا بھرا پڑا ہے وہاں۔ توبہ توبہ تاش وہ کھیلیں اور وہ بھی روپے لگا کر جوئے کی طرح۔ مجھ سے بھی ایک صاحب نے کہا تم بھی تاش سیکھ لو۔ تو

میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ’’بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔‘‘

بیگم نے اس گفتگو کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’خیر تاشوں میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ مرد یہی سب کیا ہی کرتے ہیں۔ کوئی گھوڑ دوڑ جاتا ہے، کوئی تاش کھیلتا ہے۔ کسی کو سنیما کا شوق ہے۔ ان باتوں کی تو جو روک تھام کرے اس کی بے وقوفی ہے۔‘‘

عرفان نے بالکل زنانہ انداز میں کہا۔ ’’مردوں کا تو خیر وہ کام بھی ہے جو بھائی صاحب کر رہے ہیں۔ رہ گیا جوئے کے لیے آپ کا کہنا کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے میری سمجھ میں تو آتا نہیں اب تک تو ہمارے خاندان میں کوئی جواری گذرا نہیں، اب یہ نئی باتیں ہو رہی ہیں۔‘‘

بیگم نے بڑی معقول بات کہی اور خدا کی قسم طبیعت باغ باغ کر دی کہ۔ ’’بھیا اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ جوئے کو جوا سمجھا جائے۔ اب تو یہ ایک مہذب قسم کی تفریح ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے معصوم قسم کے مشاغل میں سے ایک مشغلہ ہے۔‘‘

عرفان نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ ’’اچھا معصوم مشغلہ ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر وہ آپ سے جوا کھیلنے کے لیے روپیہ مانگیں تو شاید آپ روپیہ بھی اٹھا کر دے دیں۔‘‘

بیگم نے فوراً کہا۔ ’’بے شک دے دوں۔ اس لیے کہ روپیہ مانگنا تو ان کی شرافت ہے۔ ورنہ وہ بغیر مانگے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ کمائی آخر کس کی ہے۔ جو شخص محنت کر کے کما سکتا ہے وہ اپنی تفریح پر صرف کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔‘‘

عرفان نے مایوس ہو کر کہا۔ ’’بس تو پھر خدا ہی حافظ ہے اس گھر کا۔ جس گھر میں جوئے والی نحوست پہنچی اس گھر کا پنپنا پھر کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب آپ کا یہ حال ہے تو پھر آپ کو بھائی صاحب سے شکایت آخر کیا ہے؟‘‘

بیگم نے اپنے ان گاؤدی برادر عزیز کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ’’میں ان کی ہر بات برداشت کر سکتی ہوں۔ تفریح تو میں خود چاہتی ہوں کہ وہ کریں۔ روپے کی میری نظروں میں کوئی قیمت نہیں ہے، البتہ میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ خود ہیں اور میں کسی قیمت پر بھی ان کے حق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ شیلا مجھ سے جو چاہے لے لے۔ میرے زیور کا ایک ایک تار، میرے بینک کا ایک ایک پیسہ، میرے گھر کی ایک ایک چیز مگر ان کو میرے لیے چھوڑ دے۔‘‘

عرفان نے احمقانہ جوش کے ساتھ کہا۔ ’’اجی اس کی ایسی تیسی، بلکہ مجھے تو آپ پر بھی غصہ آ رہا ہے۔ جب بھائی صاحب کو آپ کی پرواہ نہیں ہے تو آپ کی جوتی کی نوک سے۔ وہ ایک نہیں پانچ سو شادیاں کریں۔ کیا آپ کے والد۔ کے پاس آپ کو عمر بھر بٹھا کر کھلانے کے لیے کوئی کمی ہے؟‘‘

بیگم نے جوش کے ساتھ غالباً اپنے غصے کو انتہائی ضبط کر کے کہا۔ ’’بس عرفان بس، میں اس قسم کی باتیں تم سے کیا ابا جان سے سننا بھی پسند نہیں کروں گی۔‘‘

ہم کو اس گفتگو سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ گویا بحالی صحت کے لیے گلمرگ کی وادی میں آئے ہوئے ہیں۔ عرفان ایسے بے وقوف کی باتوں پر برا ماننا کسی عقل مند کا کام نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سلسلے میں بیگم کے شریفانہ جذبات اور ایک خاتون مشرق کی بلندیوں کا اندازہ ہونے کے بعد اگر ہم کہیں کہ ہم پھولے نہ سماتے تھے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی وقت کمرہ سے نکل کر دیوانہ وار بیگم کے قدموں پر جا گریں اور جہاں گیر کی طرح اپنی نور جہاں سے کہہ دیں۔

تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

مگر فیاض کا بھوت ہر مرتبہ نگاہوں کے سامنے آ کر آنکھیں دکھاتا تھا کہ خبردار جو آگے قدم بڑھایا۔ بیگم کی شرافت مسلم، ان کے جذبات قابلِ قدر، ان کے

احساسات مقدس، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ فیاض کا یہ نظریہ روپے میں سولہ آنے درست تھا کہ بیگم نے اس ناگوار صورت حال کو اس لیے گوارا کر لیا تھا کہ ان کو ہماری ذاتِ شریف سے اس سے کہیں زیادہ خوفناک قسم کی توقعات پیدا ہو گئی تھیں۔ سوکن اور تاش کا مقابلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے میاں کا جوا نہیں کھیل سکتی تھی خواہ ان کا میاں کتنا ہی بڑا جواری کیوں نہ ہو۔ عرفان صاحب اس وقت جھاڑ کھانے کے بعد اب کوئی مزید لکچر پلانے کے لیے تیار نہ تھے اور کچھ کھوئے ہوئے بیٹھے تھے۔ بیگم نے اپنے شوہر پرستانہ جذبے کے ساتھ دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”عرفان میاں تم تو پڑھے لکھے ہو۔ خدا کے فضل سے گریجویٹ بھی ہو۔ اتنا تو تم کو ہی سوچنا چاہیے کہ ایک شریف عورت کا مطالبہ اپنے شوہر سے کیا ہو سکتا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو میں ان سے محبت بھی طلب نہیں کرتی۔ بلکہ میرا مطالبہ صرف اپنی پرستش کی پذیرائی ہے۔“

عرفان کی سمجھ سے یہ باتیں بالاتر تھیں۔ اپنے دہی کو تو سب ہی میٹھا کہتے ہیں۔ مگر ہماری رائے ایمانداری کے ساتھ بیگم کے متعلق یہ ہے کہ وہ باوجود اپنی اس کوتاہی کے عرفان کی رشتے میں بہن تھیں۔ نہ صرف ذہین اور طباع تھیں بلکہ واقعی سمجھ دار بھی تھیں۔ حالانکہ وہ نہایت سلیس اردو میں گفتگو کر رہی تھیں مگر عرفان صاحب کچھ اس طرح گردن ہلا رہے تھے گویا بھینس کے سامنے بین بجائی گئی ہے اور وہ کھڑی پگرا رہی ہے۔ اب ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اپنے گریجویٹ ہونے پر غالباً نادم تھے کہ گھر میں بیٹھنے والی معمولی تعلیم یافتہ لڑکی نے ان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو غالباً خودکشی کی تدابیر سوچتے مگر ان کی بے حسی ملاحظہ ہو کہ بھاگنے کی نیت بھی نہ کی۔ بار بار ہمارا دل چاہتا تھا کہ کاش اس وقت فیاض ہوتا اور اس سے ہم کہہ سکتے کہ دیکھ ہماری بیوی کا طرزِ عمل اور سن اس کے موتیوں میں تولنے والے الفاظ، کیا ایسی بیوی کے ساتھ یہ سلوک جو ہم روا رکھ رہے ہیں انتہائی کمینگی نہیں ہے۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ دوڑا ہوا فیاض کے پاس جاؤں اور اس کو یہ تمام گفتگو سنا دوں مگر پھر یہ سوچا کہ ہم کو اس وقت تک یہاں ٹھہرنا چاہیے جب تک ان دونوں بہن بھائیوں میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ معلوم نہیں کونسی ایسی بات ہماری عدم موجودگی میں طے پائے جس کی ہمیں اطلاع بھی نہ ہو سکے۔ آخر ہم اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک یہ گفتگو ختم نہیں ہوئی۔ اور جب عرفان اپنی بہن سے رخصت ہو کر چلے گئے تو ہم بھی اپنے حجلۂ اعتکاف سے نکل کر فیاض کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۱۴)

فیاض نے کیوپڈ کے ترکش کا وہ تیر جسے عرفان پر ضائع کرنے کا وعدہ کر چکا تھا، ضائع کر دیا تھا اور معلوم نہیں، شیلا یا عرفان دونوں میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو علیحدہ علیحدہ کیا پٹی پڑھا دی تھی کہ آج کل عرفان اور شیلا کی بہت گاڑھی چھن رہی تھی۔ عرفان کی وہ داستان والی شرم تو خیر رفتہ رفتہ دور ہو چکی تھی، مگر قدرتی طور پر ان میں جو نسائیت ہے وہ اپنی جگہ قائم تھی۔ شیلا سے آج تک تو سب لوگ یہ سمجھ کر ملتے ہوں گے کہ یہ ایک خاتون ہیں، جنسی تضاد یقینی طور پر قائم رہا ہوگا، مگر عرفان غالباً اس کو اپنی گوئیاں سمجھ کر مل رہے تھے۔ جس گوشے میں شیلا ان کو لے کر بیٹھا کرتی تھی اس کا نام ممبروں نے ”زنانہ درجہ“ رکھ چھوڑا تھا۔ رمیش کہا کرتا تھا کہ اب تک تو کلب میں صرف ایک عورت تھی مگر اب خدا کے فضل سے دو نظر آنے لگیں...... یعنی شیلا اور عرفان۔ اخلاق ان دونوں کے اتحادِ عمل سے بے حد خوش تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کلب کے ممبروں کو بیک وقت ان دونوں مصیبتوں سے نجات حاصل ہو گئی ہے۔ فیاض اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھے اور واقعی اس کی مسیحا نفسی حیرت انگیز تھی کہ اس نے عرفان ایسے جانور کو عشق کے لیے سدھا لیا تھا۔ ایک روز عرفان اور شیلا کو لان پر بالکل آخری کونے پر باتوں میں مصروف دیکھ کر فیاض صاحب کے چہرے پر کامیابی چمک رہی تھی کہ ہم نے اس سے کہا۔ ”یار فیاض تو ایک سرکس کیوں نہیں کھولتا۔“

فیاض نے ایک دم چونک کر کہا۔ ”سرکس؟“

ہم نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں سرکس، قسم خدا کی بڑے فائدے کی چیز ہے۔ اور تو اس لائن میں اس قدر کامیاب رہے کہ جس تنخواہ کی آج کل ملازمت کر رہا ہے نا، اس تنخواہ کے ملازم خود رکھ سکے گا۔“

فیاض نے حیرت سے سر سے پیر تک ہم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”طبیعت تو اچھی ہے آپ کی۔ یہ آخر بیٹھے بیٹھے آپ بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔“

ہم نے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں واقعی تجھ کو جانوروں کو سدھانے کے آرٹ میں جو ملکہ حاصل ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اس صلاحیت سے کچھ فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر عرفان کو عشق کرنا تم سکھا سکتے ہو تو بندر کو سلام کرنا، بھالو کو حقہ پینا، گدھے کو کرسی پر بیٹھنا اور بن مانس کو ہاتھ ملانا بہت ہی آسانی سے سکھا لوگے۔“

قہقہہ لگا کر بولے۔ ”اچھا یہ بات ہے۔ مگر اب میری اسکیم ذرا بدل گئی ہے۔ اب تک تو یہ تھا مذاق، مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگوں کی عمر محض دل لگی بازیوں کی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ ٹھوس قسم کا کام بھی کرنا چاہیے۔ کیوں نہ عرفان اور شیلا کی شادی کر دی جائے۔“

ہم نے ایک دم چونک کر کہا۔ ”آئیں۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟“

فیاض نے نہایت لاپرواہی سے کہا۔ ”جیسے شادی ہوا کرتی ہے بھائی۔ آخر قباحت کیا ہے۔ عرفان کی اب تک شادی نہیں ہوئی ہے شیلا بھی ناکتخدا ہے۔ لڑکا میرے نزدیک ابھی تک سنبھلا ہوا ہے۔ لڑکی بھی جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک محفوظ ہے۔ آنکھ کا پانی ضرور مر گیا ہے مگر موتی کی آب غالباً باقی ہے۔ اگر شیلا نے یہ آب بھی کھو دی تو یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوگی۔“

ہم نے جھنجلا کر کہا۔ ”آپ کیا دنیا بھر کے ٹھیکیدار ہیں۔ خدائی فوجدار

ہیں۔ آخر قصہ کیا ہے۔“

ہم سے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے وقار کے ساتھ کالر کو پکڑ کر گردن لہراتے ہوئے فرمایا۔ ”تم سمجھتے نہیں۔ اس میں ٹھیکیداری یا خدائی فوجداری کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی ایک بات ہے جو میرے ذہن میں رقص کر رہی ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرے ذہن میں غلط باتیں ذرا کم آتی ہیں۔“

ہم نے فیاض کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ان معاملات میں تم نہ پڑنا۔“

فیاض نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کیوں...... آخر کیوں نہ پڑوں اس معاملہ میں؟“

ہم نے نشیب و فراز سمجھانے کے ارادے سے کہنا شروع کیا۔ ”بات یہ ہے کہ اول تو دونوں میں مذہبی اختلاف ہے۔ دوسرے آپ کو ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ دونوں ذاتی طور پر ایک دوسرے سے کس حد تک وابستہ ہوئے ہیں۔ یہ شادی کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو دراصل انہی لوگوں کو کرنا چاہیے۔ ہم لوگ آخر کون ہوتے ہیں۔“

فیاض نے حقارت سے ہم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار ایک بات بتاؤ کہ یہ تمھاری کھوپڑی میں جو عقل ہے وہ تم نے کہیں سے سیکنڈ ہینڈ تو نہیں خریدی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ایک آدھ پرزہ یا تو ڈھیلا ہے یا کہیں گر گیا ہے۔ اس لڑائی کے زمانے میں یہ پرزے اب مل بھی نہیں سکتے۔ ارے عقل کے دشمن، اگر یہ دونوں اتنے ہی سمجھ دار ہوتے اور ایسی ہی قوتِ فیصلہ ان میں ہوتی تو آپس میں عشق کیوں فرماتے۔ جو لوگ ایک بیرونی تحریک کے ماتحت ایک دوسرے سے عشق کر سکتے ہیں وہ یقیناً اس قابل نہیں ہو سکتے کہ اپنے متعلق کوئی سنجیدہ فیصلہ خود کر سکیں۔“

ہم نے جل کر کہا۔ ”اور تمام سنجیدہ فیصلے کرنے کے لیے گویا ایک آپ خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں۔“

فیاض نے سگریٹ کیس پر طبلے کی کوئی گت بجاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب میں خدا کی طرف سے اندھوں کے شہر میں آئینہ فروشی کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے ان اندھوں کی رہنمائی کرتا رہوں۔ آپ میری اس تجویز کو غالباً اس لیے احمقانہ سمجھ رہے ہوں گے کہ خود نہایت کہنہ مشق احمق ہیں ۔

قدر گوہر شاہ داندیا بداند جوہری

مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہایت پھڑکتی ہوئی جوڑ ہے۔ نہ شیلا کو اپنی ٹکر کا ایسا بے وقوف شوہر مل سکتا ہے جیسا کہ عرفان ہے اور نہ عرفان کو اپنے پائے کی ایسی حماقت مجسم بیوی مل سکتی ہے جیسی شیلا ہے۔ اب چاہے عرفان کے سامنے وہ زندگی بھر اقبال کو شفاء الملک کہتی رہے تو بھی کسی کو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں۔ آپ نے غالباً اس نکتے پر غور نہیں کیا ہے کہ شیلا ایک سمجھ دار قسم کے شوہر کی بیوی بن کر قیامت تک نہیں رہ سکتی ہے۔ زن و شوہر کے متعلق سترہ برس کی تحقیقات کے بعد میں نے جو چارٹ بنایا ہے اس کو اگر آپ دیکھیں تو آنکھیں کھل جائیں اور اس چارٹ کے مطابق شیلا کو لازمی طور پر عرفان کی بیوی ہونا چاہیے۔ شیلا کی افتادِ طبیعت یہ ہے کہ وہ محبت کرنا چاہتی ہے اور اس شخص سے بھاگتی ہے جو اس سے محبت کرے۔ عرفان مرتے مرتے مر جائیں گے مگر کیا مجال ہے جو اظہارِ محبت کی جرأت رندانہ ان میں پیدا ہو سکے۔ لہٰذا اس حیثیت سے تو دونوں کی نبھ ہی جائے گی۔ اب رہ گیا ایک اور نکتہ جو میرے اس خیال کی تائید میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شیلا کو ایک ایسا شوہر چاہیے جو اس کی احمقانہ باتوں کو سمجھنے یا نہ سمجھنے کے متعلق گھبراہٹ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ یہ گھبراہٹ آپ کے سالے صاحب کو خزانہ غیب سے اس قدر ملی ہے کہ مالا مال نظر آتے ہیں۔ پھر یہ رفاہِ عام کا کام بھی ہے یعنی شیلا سے کسی باقاعدہ قسم کے انسان کو محفوظ رکھنا اور عرفان

سے کسی باقاعدہ قسم کی لڑکی کو بچانا۔ اگر یہ دونوں آپس میں شادی کر کے گندھ گئے تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی گویا عذابِ الٰہی سے بچ جائیں گے۔ لڑکا وہ جو شیلا کا شوہر ہونے سے بچا۔ لڑکی وہ جو عرفان کی بیوی ہونے سے محفوظ رہی۔“

ہم نے تنگ آ کر کہا۔ ”جہنم میں جائیں آپ اور بھاڑ میں جائے آپ کی اسکیم۔ قاضی کیوں دبلے شہر کے اندیشے سے۔ معلوم نہیں آپ کو کیا پڑی ہے کہ ان باتوں میں اپنا سر کھپا رہے ہیں۔“

فیاض نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”بھئی میں تو اس کو اپنا مشن سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ ہے قومی قسم کا کام۔ اب تم اس کو میرا سوراج سمجھ لو یا میرا پاکستان، بہر حال میں ان معاملات پر وہ نظر نہیں ڈالتا جو آپ حضرات ڈالا کرتے ہیں۔“

ہم نے قصہ کوتاہ کرنے کے لیے عرض کیا۔ ”اچھا صاحب اچھا آپ جو کچھ فرما رہے ہیں درست ہے مگر میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میرے متعلق بھی جناب کچھ ارشاد کر دیتے۔ یہ تو میں آپ سے عرض چکا ہوں کہ میری بیوی کو میرے تاش کھیلنے سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ میری دلچسپی کو گوارا کر سکتی ہیں۔ پھر آخر ان کو جو سزا دی جا رہی ہے اس کی کوئی میعاد بھی ہے یا نہیں۔“

فیاض نے بہت بڑے چیف جسٹس کے انداز سے کہا۔ ”یہ بالکل غلط ہے۔ میں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں اور پھر عرض کرتا ہوں کہ ان امور کو سمجھنے کی صلاحیت آپ کے اس بڑے سے سر والی چھوٹی سی عقل میں مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت آپ کی بیوی کی جو کیفیت ہے وہ بالکل اس ماں کی سی ہے جس کا نہایت آوارہ گرد بچہ، جس کو آوارگی کے سلسلہ میں خود کوسا کرتی تھی، بیمار پڑ گیا ہے اور مرنے کے قریب ہے۔ اب وہ گڑگڑا، گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی ہے کہ یا اللہ یہ آوارہ ہی ہو کر جی جائے۔ یہ بدمعاش ہی ہو کر زندہ رہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کی

آوارگی اور بدمعاشی کو برداشت کیے لیتی ہے۔ بلکہ وہ تو محض برا وقت ٹال رہی ہے۔ موت کے منہ سے جس وقت صاحبزادے نکل کر پھر بدمعاشی کی کوشش کریں گے وہ پھر بدمعاشی کے خلاف ہو جائے گی۔ اگر اس وقت جناب والا نے اپنی بیوی کو بتا دیا کہ یہ سب کچھ مفروضہ قصہ ہے، نہ کوئی شادی ہو رہی ہے نہ کوئی سوت آ رہی ہے تو وہ یقیناً خوش تو بہت ہوں گی۔ سوکھے دھانو میں پانی چڑھ جائے گا، مگر آپ کا حشر کچھ مناسب نہ رہے گا۔ وہ پھر اپنے دوسرے مطالبات جن کو اس وقت تک وہ آپ کے لیے جائز کہہ رہی ہیں، گھما پھرا کر آپ سے تسلیم کرانا چاہیں گی اور جس آزادی کے لیے آپ نے یہ جنگ اس وقت لڑی ہے وہی آزادی تاوانِ جنگ کے طور پر ان کے سپرد کرنا پڑے گی۔“

ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب سوال تو یہ ہے کہ جو جھگڑا آپ نے پھیلایا ہے اس کو سمیٹنا آخر کب شروع کریں گے۔“

فیاض نے مدبرانہ انداز سے کہا۔ ”میں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس کے بعد حالات خود بخود درو براہ ہونا چاہیے۔ اب دراصل مجھے یا تم کو کچھ کرنا دھرنا نہیں ہے بلکہ اپنے کو حالات کے سپرد کر کے انتظار یہ کرنا ہے کہ وہ خود کب اصلیت کو ڈھونڈنے کے لیے نکلتی ہیں اور کب ڈھونڈتی ہیں۔ اس عرصہ میں ہمارا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہم ضمنی واقعات کو جہاں تک ہو سکے دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ اگر آسانی سے ممکن ہو تو مفید بناتے چلے جائیں۔ مثلاً شیلا اور عرفان کے قصے کو نے لیجیے۔ بظاہر یہ قصہ آپ کے اصل معاملے سے ایک علیحدہ چیز نظر آ رہا ہے۔ مگر حالات ثابت کریں گے کہ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ مختصر یہ کہ میرا یا آپ کا یا کسی زید، عمر، بکر کا، آپ کی بیوی پر راز کھولنا اسی قدر مضر ہے جس قدر خود ان کا اس راز کی تہ تک پہنچنا مفید ہو سکتا ہے اور دیکھ لیجیے گا کہ وہ نہایت ڈرامائی انداز کے ساتھ بہت ہی جلد

اس راز کی تہہ تک پہنچ جائیں گی۔"

ہم نے راضی برضا ہوتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو مگر اب تو طبیعت الجھ کر رہ گئی ہے۔"

بڑے اطمینان سے بولے۔ "طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم نہایت طفلانہ جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔ حالانکہ حقوق حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ حقوق ملکی ہوں یا قومی، ذاتی ہوں یا صفاتی، ہر ایک کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اپنے ملک کے سیاسی حالات پر غور کیجئے کہ کتنے دنوں سے آپ کے سیاسی رہنما جنگ آزادی میں مصروف ہیں اور نہ جانے کیا کیا مصیبتیں اٹھا چکے ہیں۔ آپ تو ابھی تک نہ جیل گئے ہیں نہ پولیس نے آپ پر ڈنڈے چلائے ہیں اور نہ کوئی اور مصیبت جھیلی ہے۔ خاموشی سے انتظار کیجئے۔ اب آپ کی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔"

شیلا اور عرفان دونوں اسی طرف آ رہے تھے لہٰذا ہم لوگوں نے اس گفتگو کو یہیں ختم کر دیا۔

(۱۵)

بیگم صاحبہ کو اپنے برادر عزیز عرفان کی حماقتوں کا پورا احساس تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ عرفان کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ تھیں۔ نازو کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ کبھی بیگم صاحبہ ان کے یہاں چلی گئیں کبھی وہ ہمارے یہاں آ گئیں۔ فیاض سے اس قسم کی تمام اطلاعیں ہم کو مل جایا کرتی تھیں اور ہم اسی پروگرام کے مطابق کبھی فیاض کے ہاں پہنچ جاتے تھے، کبھی خود اپنے گھر کے اس کمرے میں جہاں سے ہمیشہ یہ سازشی گفتگو سنا کرتے ہیں۔ آج نازو ہمارے یہاں آئی ہوئی تھیں اور بیگم ان سے سر جوڑ کر نہایت اہم قسم کے مشوروں میں مصروف تھیں۔ ہم اپنے اسی کمرہ میں ایک ٹرنک پر بیٹھے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ اس گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھے کہ یکا یک بیگم نے نازو سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ بہن مجھے اس عرفان کی طرف سے کوئی اطمینان نہیں ہے۔ ایک تو پرلے سرے کا بے وقوف، دوسرے خدا کے فضل سے اعلیٰ درجے کا جھوٹا، نہ جانے کتنی باتیں سچ کہتا ہے، کتنی باتیں جھوٹ۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ مجھے کلب کے حالات معلوم ہوتے رہیں مگر عرفان نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ مسلسل ان کی طرف سے بھڑکانے اور بہکانے میں مصروف ہے۔"

نازو نے ایک قانونی نکتہ نکال کر کہا۔ "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ تم کو بہکانے اور بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہو وہی سچ ہو۔ بھڑکانے یا

بہکانے سے آخر اس کا فائدہ کیا۔ اور یہ تم کیوں کر سمجھ سکتی ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔”

بیگم نے عجیب محققانہ بات کہی۔ “ارے تمھیں معلوم نہیں کہ عرفان بچپن کی سے لے کر اس وقت تک ایک ایک دن کی حالت میری نظر کے سامنے سے گذری ہے۔ جھوٹ وہ ارادتاً نہیں بولتے بلکہ یہ ان کی ایک بے ساختہ ادا ہے اور پہچاننے والے فوراً پہچان لیتے ہیں کہ کون سی بات انھوں نے سچ کہی ہے اور کون سی بات جھوٹ۔ سچ بولتے وقت ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں سے جھوٹ شروع کرتے ہیں، عجیب عجیب علامتیں رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً کچھ ہکلانا شروع کر دیتے ہیں۔ آنکھیں جلدی جلدی کھولتے اور بند کرتے ہیں۔ ناک کے نتھنے پھلا لیتے ہیں۔ داہنی کنپٹی پھڑکنے لگتی ہے۔”

نازو کو بڑے زور سے ہنسی آ گئی اور اس نے بمشکل تمام ہنسی پر قابو پا کر کہا۔ “بڑی بڑی پہچانیں تم نے اس کی مقرر کر رکھی ہیں۔ مگر میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ آخر اس کو اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔”

بیگم نے کہا۔ “ضرورت؟ یہ ضرورت کیا کم ہے کہ اس طرح سے وہ گویا میری خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔”

نازو نے کہا۔ “پھر آخر کیا صورت اختیار کی جائے۔”

بیگم نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ “صورت اب صرف یہی ہے کہ میں فیاض بھائی کو بلواتی ہوں اور ان کی ہر طرح خوشامد کر کے انھیں اپنا راز دار بنانے کی کوشش کروں گی۔”

نازو نے غور کرتے ہوئے کہا۔ “بھئی تم سمجھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے خفا نہیں ہو جائیں کہ میں نے تم سے کیا کہا۔”

بیگم نے پرچہ لکھتے ہوئے کہا۔ “وہ خفا نہیں ہوں گے اس کی ذمہ دار میں

ہوں۔ ابھی یہ پرچہ بھجوائے دیتی ہوں۔ اگر گھر پر ہوئے تو فوراً آ جائیں گے۔”

بیگم نے پرچہ لکھ کر فوراً ملازم کے ہاتھ فیاض کے یہاں بھیج دیا اور اس عرصہ میں وہاں تو چائے پانی شروع ہو گیا۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ فیاض کی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی لہٰذا ہم لپک کر پھر اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔

فیاض نے اندر آتے ہی دور ہی سے کہا۔ “آداب عرض کرتا ہوں بھابی۔ یہ آج میری طلبی کس سلسلے میں۔ اس بزم ناز میں اہل نیاز کو کیوں یاد کیا گیا۔”

بیگم نے ساڑی کا آنچل درست کرتے ہوئے تعظیماً کھڑے ہو کر کہا۔ “اللہ اکبر! آپ تو شاعری کرتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ کا یہ تخلص یہاں بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ بھی تشریف لے آئیں۔”

فیاض نے کہا۔ “اور خود آپ کا تخلص کہاں ہے؟”

بیگم نے برجستگی سے کہا۔ “کیا بتاؤں وہ کسی اور کے مقطع میں لگ گیا ہے۔”

فیاض نے گویا چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ “جی! کیا فرمایا آپ نے۔ ارے نہیں، وہ ایسا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مقطع میں کوئی سخن گسترانہ بات آ پڑی ورنہ آپ اس کے متعلق ایسی بات نہ کہتیں۔”

بیگم نے معنی خیز تبسم کے ساتھ گردن ہلا کر کہا۔ “آپ مجھے بنانے کو رہنے دیجیے۔ آپ تو بڑے قانونی آدمی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اخفائے جرم بھی اتنا بڑا جرم جتنا کہ اصل جرم۔ یہ بھی قابلِ دست اندازی پولیس ہو سکتا ہے اور وہ بھی۔”

فیاض نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ “داروغہ جی چاہے جیسی قسم لے لیجیے، مجھے کچھ نہیں معلوم۔”

بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ “ارے فیاض بھائی، اگر میں واقعی داروغہ جی ہوتی

تو اس وقت آپ ٹکٹکی پر بندھے ہوئے نظر آتے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کی یہ بیگم صاحبہ جو ہیں ان سے تو کوئی سراغ ملتا نہیں مگر مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے کلب میں آج کل کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ذاتی طور پر اپنے دوست کی تائید میں نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں۔ صرف آپ پر لازم یہ ہے کہ آپ نے اب تک مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش کیوں کی۔"

فیاض نے بڑی عمدہ ایکٹنگ کرتے ہوئے کچھ گھبرا کر کچھ ہکلا کر کہا۔ "جی واہ...... میرا مطلب یہ کہ...... مجھے تو...... کسی ایسے کھیل کی کوئی خبر نہیں ہے۔"

بیگم نے ملازم کو آواز دے کر آئینہ لانے کے لیے کہا اور فیاض سے بولیں۔ "میں ابھی خود آپ کو آپ کی صورت دکھاتی ہوں جس پر اخفائے جرم کی تمام علامتیں چہرے کا نور بن کر چھائیں ہیں۔"

فیاض نے گویا جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ "صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ میں ذرا ان معاملات سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ میاں بیوی کا جھگڑا ہی کیا۔ آنکھ کے ایک اشارہ اور لبوں کے ایک تبسم سے درمیانی خلیج پاٹ دی جاتی ہے ؎

تم گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا

مگر بیچ میں پڑنے والوں کا گلا خواہ مخواہ کٹتا ہے۔ ان حضرت کو اگر خبر ہو گئی تو وہ یہی کہیں گے کہ میری بیوی کو بھڑکایا۔ آپ سے کچھ نہیں کہتا ہوں تو آپ اخفائے جرم گردانتی ہیں۔ ان حالات میں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ میرے حال پر رحم کریں اور مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔"

بیگم نے فیاض کو قائل کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے فیاض بھائی۔ کچھ نہ کہنے کی صورت میں بھی آپ کہہ تو سب کچھ گئے۔ آپ کی گفتگو سے کم سے کم یہ تو معلوم ہی

ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ قصہ ضرور ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس قصے کے تمام حالات کی آپ کو پوری اطلاع ہے، پھر آپ کی یہ اخفائے راز کی کوشش سوائے عقل مندی کے اور کیا کہی جا سکتی ہے۔ مجھے تمام حالات خود معلوم ہیں۔ مگر میں آپ کو اپنا بھائی سمجھ کر آپ سے صرف اتنی ہمدردی چاہتی ہوں کہ آپ مجھ کو کلب کے اندرونی حالات کی اطلاع دیتے رہیں تا کہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ وہ کم سے کم میرے علم میں ہو۔"

فیاض نے شرارت کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ "خیر، بھائی بنانے کی تکلیف تو گوارا کیجئے نہیں۔ میں بھائی بن کر ایسی اچھی بھاوج کے حقوق سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ ایک مرد کی اس سے بڑھ کر بد نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا کی تمام حسین عورتوں کا بھائی بن کر رہ جائے۔ میں اس خسارے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ البتہ اگر آپ اس تکلیف دہ قصے سے باخبر رہنے کے لیے ایسی ہی مصر ہیں تو میں جو کچھ آپ پوچھیے گا، بتاتا رہوں گا۔ لیکن ایک بات پھر عرض کر دوں کہ آپ کے شوہر نامدار میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں اور میں اس طرح گویا ان کی برہمی مول لے رہا ہوں۔ جہاں تک آپ سے ہو سکے میرے اور ان کے تعلقات کو خراب نہ ہونے دیجئے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔"

بیگم نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ "اچھا اب یہ بتایئے کہ آپ کی نئی بھاوج کب آ رہی ہے اور یہ شادی آخر کب تک ہو جائے گی۔"

فیاض نے گویا اپنے اوپر بہت جبر کر کے کہا۔ "بھائی کیا بتاؤں کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بن کہے رہا نہیں جاتا۔ میں نے اس سلسلے میں جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا، ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے میاں شریف کو سمجھایا۔ بلا کمبخت کو ڈرایا دھمکایا۔ اس کے باپ کو نہ جانے کیا کیا پٹی پڑھائی۔ اس کی برادری میں فرقہ وارانہ سوال پیدا کیا مگر کوئی صورت کارگر نہ ہو سکی۔ شیلا ان کے لیے سب کو

چھوڑنے کو تیار ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنا مذہب بھی ...... اور آپ کے شوہر تو معاف کیجیے گا خانہ ساز قسم کے چغد واقع ہوئے ہیں۔ جب میں نے ان کو بہت سمجھایا تو آخری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ بھائی شیلا مجھے نہیں چھوڑ سکتی۔ یوں چاہے مجھے زمانے کا زمانہ چھوڑ دے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں، جب کہ وہ میرے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہے۔ اور بھائی میں نے اندازہ کیا ہے وہ واقعی وہ کمبخت تو کچھ دیوانی سی ہوگئی ہے۔ میں نے تو اسے یہاں تک کہا کہ ارے بھائی اگر تجھے عشق ہی کرنا ہے تو میں موجود ہوں۔ میری بیوی مجھے نہایت آسانی سے اجازت دے دے گی۔"

نازو نے چمک کر ایک دم کہا۔ "ارے سنا کہ نہیں۔ ذرا حواس ٹھکانے رکھنا۔ سنجیدہ باتوں میں مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ چلے ہیں وہاں سے عشق کرنے۔ میں کوئی رفو تو ہوں نہیں کہ گھر میں بیٹھی ٹسوے بہاتی رہوں۔ کلب میں پہنچ کر اس کتیا کی ایسی خبر لوں کہ صورت بھی پہچانی نہ جائے۔"

فیاض نے منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایسی ہی تو آپ رستم ہند ہیں۔ قسم خدا کی اگر وہ ایک ہاتھ رسید کرے تو آپ انیس قلابازیاں کھا جائیں۔ یہ تمام فیصلے اسی وقت تک ہیں جب تک میں ذرا شرافت سے کام لے رہا ہوں۔ ابھی اگر سنجیدگی سے کسی اور کا شکار ہو جاؤں تو بیگم صاحبہ کی طبیعت صاف ہو کر رہ جائے۔"

بیگم نے اس گفتگو کو غیر متعلق سمجھ کر کہا۔ "آپ دونوں میاں بیوی تو گھر جا کر تفصیل سے لڑیے گا۔ اس وقت تو مجھے یہ بتایئے کہ آخر آپ کے دوست کا پروگرام کیا ہے یعنی شادی کے متعلق کیا طے ہوا ہے؟"

فیاض نے کہا۔ "مجھے بخدا کچھ نہیں معلوم، آپ یقین جانئے کہ میں ان دونوں کی باہمی دل چسپی سے اس قدر گھبراتا ہوں کہ مجھے شیلا سے نفرت تو خیر تھی ہی

آپ کے میاں صاحب سے کوئی بھی رغبت باقی نہیں رہی ہے۔ البتہ شیلا کے باپ سے یہ پتہ ضرور چلا تھا کہ دسمبر کی تعطیل میں غالباً یہ شادی ہو جائے گی بشرطیکہ آپ کے میاں نے فیروزہ آباد والی کوٹھی اور باغ شیلا کے نام لکھ دیا۔"

نازو نے تعجب سے کہا۔ "فیروزہ آباد والی کوٹھی اور باغ! اس پر ان کا کیا حق ہے؟ وہ تو رفو کی ملکیت ہے نا۔"

بیگم نے اس کو معمولی بات سمجھ کر کہا۔ "خیر یہ تو کوئی بات نہیں، اگر وہ محض جائداد ہی کے لیے ان سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ سب کچھ اس کے نام لکھنے کو تیار ہوں مگر سوال تو یہ ہے کہ آپ کے دوست نے اس مطالبہ کا کیا جواب دیا ہے۔"

فیاض نے بغیر کسی پس و پیش کے بے دھڑک یہ عظیم الشان جھوٹ بول دیا کہ جائداد لکھنے کو تو تیار ہیں۔ مگر فیروزہ آباد والی نہیں بلکہ لکھنؤ والی جو خود ان کی ہے اس لیے کہ غالباً اس سلسلے میں وہ آپ کے شرمندۂ احسان ہونا نہیں چاہتے مگر شیلا کے باپ کی کوشش یہی ہے کہ فیروزہ آباد والی جائداد کے معاوضہ میں لکھنؤ والی جائداد تو لکھ دی جائے آپ کے نام اور فیروزہ آباد والی جائداد شیلا کو اس لیے دے دی جائے کہ وہاں سے قریب ہی میں پوری میں ان کا اصلی وطن ہے۔ تو اب یہ سمجھئے کہ اس معمولی سی گفتگو کی وجہ سے ذرا معاملات گڑبڑ میں پڑے ہوئے ہیں ورنہ اب تک یہ شادی ہو چکی ہوتی۔

بیگم نے خاصدان فیاض کی طرف بڑھایا۔ پانی پیتے ہی فیاض نے بیگم سے کہا۔ "بھائی آپ مجھے فیروزہ آباد والی جائداد کے کاغذات ذرا دکھایئے تو۔"

یہ سنتے ہی ہمارا دم نکل گیا۔ اس لیے کہ یہ کاغذات اسی کمرے میں بلکہ اسی بکس کے اندر بند تھے جس پر ہم بیٹھے ہوئے اس کانفرنس کی روئداد سن رہے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ بھاگیں تو کدھر اور چھپیں تو کہاں۔ کمرے کے باہر مالی پانی دے رہا تھا۔ دوسرے دروازے سے بیگم تشریف لانے والی تھیں۔ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ گھبرا کر ہم اس کونے میں چھپ گئے جہاں خس کی ٹٹیوں کے پیچھے مکڑیوں نے نہایت محفوظ جگہ سمجھ کر ہزاروں جالے تن رکھے تھے۔ شکر ہے کہ ہمارے چھپتے ہی بیگم کمرے میں آئیں اور بکس کھول کر کاغذات نکال ہی رہی تھیں کہ ہمارا پیر ایک ٹین کے ڈبہ پر اس طرح پڑا کہ ہم تو خیر دم سادھ کر رہ گئے۔ مگر ادئی کا نعرہ بلند کر کے اچھل پڑیں۔ فیاض اور ناز و گھبرا کر دوڑ پڑے کہ کیا قصہ ہے۔

بیگم نے دونوں کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں ان کم بختوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ ایک سے ایک قدم آدم چوہا بھرا پڑا ہے۔ کمبخت چوہے دان تک تو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ بلی پالی تھی اس کو بھی کمبخت کھا گئے۔“

یہ قدم آدم چوہا خاموشی سے اپنی شان میں یہ قصیدہ سنتا رہا اور یہ کاغذات لے کر باہر نکل گئیں۔ اب ہم اس کمرے میں نہ ٹھہر سکے۔ جالے نہ جانے کہاں کہاں چپک گئے تھے اور مکڑیاں اپنے عیال واطفال کے ساتھ ہمارے جسم کے مختلف حصوں پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ ہم نے جھانک کر مالی کو دیکھا۔ وہ ایک جھاڑی کے اندر کچھ اور جھانک رہا تھا۔ مالن اس کے قریب کھڑی گھونگھٹ کے اندر سے اس کو بڑی لگاوٹ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ موقعہ غنیمت جان کر ہم باہر نکل آئے اور چپکے سے ایک طرف کو رینگ گئے۔

(۱۶)

کلب کی فضائیں آج کل کچھ عجیب وغریب تھیں۔ فیاض صاحب اپنی جگہ پر ڈکٹیٹر بنے ہوئے تھے۔ ہم ایک عجیب گومگو کے عالم میں تھے کہ دیکھیں ہمارا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اخلاق اور رمیش وغیرہ خاموش تماشائیوں میں شامل تھے۔ شیلا اور عرفان کا تو پوچھنا ہی کیا ان دونوں کا تو حال یہ تھا کہ گویا ؎

فارغ زخزانے وہم از باغ و بہارے

شیلا پر تو خیر کوئی تعجب نہیں مگر عرفان کو دیکھ دیکھ کر تعجب بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی تھی اور فیاض کی جادوگری کا قائل ہونا پڑتا تھا کہ اس زمین شور سے ثمر عشق پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ عرفان کو رومان سے کبھی بھی کوئی مناسبت پیدا ہو سکتی ہے مگر وہاں تو جانبین میں اس بلا کی سنجیدگی تھی کہ عشق کے سلسلے میں صحرائے نجد یا وادی بے ستون نے بھی ایسی سنجیدگی مشکل ہی سے پیش کی ہوگی۔ حد یہ ہے کہ شیلا بالاعلان سب سے کہہ چکی تھی کہ وہ عرفان کو ہر طرح سمجھ چکنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ عرفان اس کی زندگی کا ایک لازمی جز ہے اور اس نے اپنا یہ فیصلہ بھی ہر ایک کو سنا دیا تھا کہ زندگی کی اس دوڑ میں بغیر عرفان کے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی۔ فیاض صاحب تو ایسے موقعوں کی تلاش ہی میں رہتے ہیں۔ خدائی فوجدار جو ٹھہرے۔ پھر یہ صورت حال تو انھیں کے افکارِ طبع کا گویا ایک کامیاب نتیجہ تھی۔ آپ نہایت شفقت کے ساتھ ان دونوں کے گارجین بنے

ہوئے تھے۔ مشورے دے رہے ہیں۔ ڈانٹ رہے ہیں۔ تنبیہیں کر رہے ہیں۔ تمام نشیب وفراز سمجھا رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ دونوں کی بزرگی کا گویا آپ کو شرف حاصل ہے۔ عرفان اس سلسلے میں ہاں تو نہیں کہتے تھے مگر نہیں کہنا ہی ہاں کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی مثل تو وہی تھی کہ ''من چاہے مڑیا ہلائے۔'' آج بھی کلب میں ہم لوگوں نے ادھر ادھر سے لوگوں کو پکڑ کر اپنی رمی کا کورم پورا کیا۔ اور یہ تینوں ہم سب سے بہت دور ایک طرف کرسیاں ڈالے اپنی کانفرنس کرتے رہے۔ آخر رمیش سے ضبط نہ ہوسکا اور اس نے کہہ ہی دیا۔

''بھائی یہ غلط ہے۔ خدا کی قسم کی بے انتہا دل چاہ رہا ہے ان لوگوں کی باتیں سنی جائیں۔ شیلا اور عرفان تک کی کانفرنس تو برداشت کی جاسکتی مگر یہ فیاض صاحب کی شرکت بڑی معنی خیز بھی ہے اور خطرناک بھی۔ میں ضرور سنوں گا کہ یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

خیریت یہ تھی کہ عرفان، شیلا یا فیاض ہم لوگوں کے بالکل سامنے نہ تھے ورنہ وہ ہمارا یہاں سے اٹھنا دیکھ لیتے۔ رمیش کے اصرار پر ہم سب کے سب دبے پاؤں وہاں تک پہنچے، جہاں یہ کانفرنس اپنا کوئی نہایت ضروری اجلاس کر رہی تھی۔ ہم سب آڑ لے کر کھڑے ہوگئے اور ان کی گفتگو سننے لگے۔ فیاض صاحب اس وقت اپنا خطبۂ صدارت پڑھ رہے تھے۔ مخاطب تھی شیلا اور آپ فرمارہے تھے۔

''آپ تو ہیں بے وقوف۔ بھارتی صاحب کو آخر کیا انکار ہوسکتا ہے۔ دوسرے جب میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ان کو سمجھانے کی ذمہ داری میری ہے تو پھر آپ کا دم کیوں نکلا جاتا ہے۔''

شیلا نے کہا۔ ''فیاض صاحب میں تو خود کہتی ہوں آپ سمجھایئے مگر آپ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ شادی کے بعد سمجھالیا جائے گا۔ بس یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

فیاض نے پھر ایک مدلل بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے صاحب یا تو یہ طے کر لیجئے کہ آپ مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں ورنہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کیجئے۔ آپ کے والد محترم کے لیے تو صرف اسی قدر کافی ہے کہ آپ گویا شادی کر رہی ہیں۔ خواہ آپ کا شوہر ہر خرے کہ باشد ورنہ از روئے قاعدہ تو ان کو آپ سے شادی کی امید ہی نہ ہونا چاہیے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ یوں تو گویا ایک قسم کا احسان ہے جو آپ پر ان پر اور اپنے خاندان پر اس شادی کے سلسلے میں کریں گی۔ ورنہ اس پر برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ جو آزادی آپ کو حاصل ہے اس کے بعد ان کو اپنی ناک کی طرف سے کسی وقت بھی کوئی اطمینان نہ ہونا چاہیے۔''

شیلا نے برا ماننے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فیاض نے پھر ڈانٹا۔ ''پہلے پوری بات سن لو۔ اس کے بعد تیوریوں پر بل ڈالنا۔ میں کہہ رہا ہوں ایک سچی بات جو ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب کسی سے پوچھنے گچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سب باتوں کے لیے آخر میں موجود ہوں یا نہیں۔ اس بے چارے کو دیکھو خدا کے فضل سے ماں باپ سب موجود ہیں۔ مگر ایسا سعادت مندی کے ساتھ یتیم بنا ہوا میرے سامنے بیٹھا ہے اور ہر بات کا اختیار مجھے دے رکھا ہے۔ اب تو اگر یہ ذرا بھی انکار کرے تو خدا کی قسم مارتے مارتے حلیہ بگاڑ دوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ بھئی تم تو ایک شریف خاندان کی لڑکی ہو۔ یہ بھی ایک شریف خاندان کا چشم وچراغ ہے۔ آخر خوامخواہ بدنامی کیوں ہو۔ شیطان کو اپنا کام کرتے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی دونوں طرف بھرپور جوانی ہے۔ دلوں میں ایک دوسرے کے جذبات، تنہائی کی یہ ملاقاتیں، ہوا کے یہ ٹھنڈے جھونکے، موسم کی یہ کافر چاندنی، معلوم نہیں کس وقت کیا واردات ہوجائے۔ اسی وقت سے میں ڈرتا ہوں۔ اور اسی وجہ سے یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح جلد سے جلد دونوں قانونی اور سماجی طور پر ایک دوسرے کے ہوجاؤ۔''

شیلا نے اپنے ناصح مشفق کی ایک ایک بات گرہ میں باندھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال یہ بات ہونا تو ہے ہی۔ مجھ سے زیادہ مشکلات ان کو ہیں۔ مگر جب یہ ہر بات کے لیے تیار ہیں تو میں بھی سب کچھ برداشت کروں گی۔ بس میں چاہتی یہ تھی کہ کسی طرح آپ ڈیڈی کو اس میں شریک کر لیتے۔“

فیاض نے پھر ایک ڈانٹ بتائی۔ ”ڈیڈی، ڈیڈی! کچھ نہیں جو میں کہتا ہوں وہ ہوگا یا پھر کہہ دو کہ مجھے کوئی حق ہی نہیں۔“

شیلا نے جلدی سے کہا۔ ”حق کا سوال نہیں فیاض بھائی۔ آپ تو برا مان جاتے ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہ پیدا ہو۔ بلکہ اگر آپ کی رائے ہو تو عرفان کے والد بھی اس میں شرکت کریں تو اچھا ہے۔“

عرفان نے گھبرا کر اپنے مخصوص انداز کے ساتھ کہا۔ ”نہیں، ابا میاں نہیں۔“

شیلا نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟“

عرفان نے مظلومیت سے فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے فیاض صاحب یہ سمجھتی بوجھتی ہیں تو میں نہیں۔ ڈانٹنے لگتی ہیں۔ ابا میاں بھلا یہ سن کر زندہ چھوڑیں گے مجھے۔“

فیاض نے عرفان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نہ ان کے ابا کی ضرورت ہے نہ آپ کے ڈیڈی کی۔ وہ دونوں اپنی اپنی شادیاں بغیر آپ کے مشورے کے پہلے ہی کر چکے ہیں۔ تم سمجھتی نہیں ہو شیلا۔ یہ ان بڈھوں کی خاص عادت ہوتی ہے کہ ان کو اپنے رومان انگیز خوردوں کے ارمانوں کا خون کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ بھلا بتایئے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی نہایت خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہیں تو ان حضرات کی گرہ سے کیا جاتا ہے، مگر نہیں، وہ جب تک ہزار کاوٹیں پیدا نہ کریں گے اس وقت تک ان کو چین تھوڑی ہی آتا ہے۔ مثنوی زہر عشق پڑھی ہے تم نے، اس بے چاری کو بنارس بھیجا جا رہا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا...... کل کے لیے پان لگائے، زہر کھایا اور سو رہی۔ اگر یہی ارادہ آپ کا بھی ہو تو منگواتا ہوں پاندان اور کرتا ہوں جنازے کا انتظام۔“

شیلا نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔“

فیاض نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں تو خیر میں آداب عرض کرتا ہوں۔ مگر میں اس وقت جو گفتگو کر رہا ہوں وہ دلچسپی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد تفنن طبع ہے۔ بلکہ میں واقعی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں۔ چپکے سے عدالتی طور پر سول میرج ہو جائے۔ اپنے چند خاص خاص دوست شریک ہوں اور کلب میں ایک چھوٹا سا ڈنر، اس کے بعد ان بزرگوں کو خبر ہوتی رہے گی۔ اچھلیں گے، کودیں گے اور رہ جائیں گے۔ اس وقت تو اندیشہ یہ ہے کہ فرض کر لیجئے کہ ان دونوں میں سے کوئی بزرگ زیادہ اچھل گیا تو اس کا اثر بلاوجہ شادی پر پڑے گا۔ میں اس عقل مندی کا قائل نہیں ہوں کہ چلتی گاڑی میں روڑے اٹکائے جائیں۔ کہو کیا کہتی ہو؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ سر کھپاتا رہوں۔“

شیلا نے عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی تو کچھ بولو۔“

عرفان نے دیا سلائی کی تیلی چباتے ہوئے کہا۔ ”ہم کیا جانیں، جو آپ لوگوں کی رائے ہو وہ کیجئے۔“

فیاض نے عرفان کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے نعرہ بلند کیا۔ ”شاباش اس کو کہتے ہیں عقل مندی کہ بھئی اگر خود عقل نہیں ہے تو وہ بے چارہ دوسرے کی عقل سے کام لے رہا ہے۔ آپ کی طرح تھوڑے ہی عقل غائب اور حماقت حاضر بہر حال اب عرفان تو اپنی رائے دے چکا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہیے اور میری جان چھوڑیئے اس

لیے کہ اور انتظامات بھی تو مجھ ہی کو کرنا ہیں۔"

شیلا نے کچھ دیر سناٹے میں آنے کے بعد عرفان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اور واقعی انتہائی جذبات میں ڈوب کر کہا۔ "میں تو اپنے کو ان کے حوالے کر ہی چکی ہوں۔ اب اگر آپ کی یہی مرضی ہے کہ تو ہم لوگوں کے والدین کو بعد میں اطلاع ہو تو مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں، جو دن اور تاریخ چاہیے مقرر کر لیجیے۔"

فیاض نے شیلا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس یہ ایک بات کہی ہے۔ اب میں کل تک تم لوگوں کو تاریخ بتا دوں گا۔ چلو دیر ہو رہی ہے انھیں یہاں سے۔"

یہ لوگ اس طرف اٹھے اور ادھر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

(۱۷)

عرفان گویا اب تک ہمارے یہاں مخبری کر رہے تھے۔ روزانہ جانے کی بجائے پہلے تو ان کی حاضری گنڈے دار ہونے لگی اور اس کے بعد ہفتے میں دو بار رہ گئی ہے مگر بیگم کو بھی ان کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ اس لیے کہ اسی خدمت کے سلسلے میں وہ اپنے کو ہر ممکن طریقے سے انتہائی بے وقوف ثابت کر چکے تھے۔ بیگم ان کی باتیں سن تو لیتی تھیں مگر کسی ایک بات کو بھی توجہ کے قابل نہ سمجھتی تھیں مگر ہم اب بھی اس کی ہر ایک بات اپنے اسی گوشے میں بیٹھ کر نہایت غور سے سنا کرتے تھے، محض یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ اس کا ایسے بے وقوف آدمی بھی جھوٹ بولنے والے کی خداداد صلاحیت سے کیسے کیسے برجستہ کام لیتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کے متعلق یہ بات تو گویا طے ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو یقیناً بے وقوف سمجھتا ہے اور جھوٹ بولنے کو آرٹ کا درجہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ اپنے اس فن کے ذریعے ایک ایسا سحر کر رہا ہے کہ ایک غلط چیز کو صحیح ثابت کر کے دکھا دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ جھوٹ کا بحیثیت فن کے بڑا درجہ ہے اور اگر کوئی صحیح معنوں میں فن کار اس فن کے کمالات دکھانا شروع کر دے تو جھوٹ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ اکبر! یہ بھی کتنا عظیم الشان اور وسیع فن ہے۔ ایک جھوٹ بولنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ بھی ہو۔ ذہین بھی ہو۔ عام معلومات پر حاوی ہو۔ سیاسیات پر عبور رکھتا ہو۔ بذلہ سنج ہو۔ حاضر جواب ہو، اچھا خطیب ہو۔ جب تک اداکاری میں دخل ہو اس وقت تک اس کو

جھوٹ بول کر جھوٹ کی عظمت کو پستیوں میں لانے کا ارادہ نہ کرنا چاہیے۔ ایک بے وقوف اور نومشق جب کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا ہے لوگ فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ یہ جھوٹا ہے۔ اس کے چہرے پر جھوٹ کی تختی لٹک رہی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ذلیل انسان مشکل ہی سے کوئی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب ایک فن کار جھوٹ بولتا ہے تو اس کے جھوٹ کو سیاسی، تاریخی اور جملہ قسم کی عالم گیر حیثیتیں دی جاتی ہیں اور یہ فن کار اپنی انہی فن کارانہ دروغ بافیوں کے سہارے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچتا ہے۔ ڈکٹیٹری کرتا ہے۔ کہیں ہٹلر کہلاتا ہے کہیں مسولینی۔ مختصر یہ کہ اگر بدنام ہی ہوتا ہے تو ناموری کے ساتھ اور ایمان کی بات بھی یہی ہے کہ جھوٹ بولنا ہما شما کے بس کا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اگر ہم لقمان ہوتے اور ہم سے کوئی پوچھتا کہ دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام کیا ہے تو ہم آنکھ بند کر کے کہہ دیتے کہ جھوٹ بولنا۔ اصل میں ایک تو ہوتا ہے جھوٹ بولنا اور ایک ہوتا ہے جھوٹ بکنا۔ جھوٹ بولنے کا حق جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہٹلر اور مسولینی قسم کے عظیم المرتبت لوگوں کو حاصل ہوسکتا ہے اور جھوٹ بکنے کے لیے جس کا جی چاہے بک لے۔ چنانچہ یا تو کوئی بہت بڑا مدبر جھوٹ بولتا ہے یا کوئی پرلے درجے کا بے وقوف جھوٹ بکتا ہے۔ درمیانی لوگ عام طور پر سچ بولا کرتے ہیں۔

عرفان صاحب جو کچھ بھی تھے وہ اب ہم سے کیوں کہلوایئے۔ خود سمجھ لیجیے۔ بہرصورت آج کل آپ ایک دوعملی میں مبتلا تھے ع

بابا شراب خورد بہ زاہد نماز کر

بلکہ یہ مصرع بھی ان کی پوری کیفیت پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ ادھر تو شیلا کے ساتھ جناب کی شادی طے ہوچکی تھی اور ادھر اپنی ہمشیرہ محترمہ کے گویا مخبر بنے ہوئے تھے۔ جب تشریف لاتے تھے ایک آدھ نوتصنیف افسانہ اپنی بہن کو سنا کر اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ عورت ناقص العقل تو ہوتی ہی ہے۔ گویا خود ان سے بھی زیادہ ناقص العقل ہونا

ممکن ہے۔ آپ اپنے نزدیک بہت ہاتھ پیر چلا کر، آنکھیں مٹکا کر اور مناسب موقعوں پر منہ چڑھا چڑھا کر جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر خدا نہ کرے کہ کسی کے متعلق یہ اعتقاد پیدا ہوجائے کہ یہ شخص بے وقوف بھی ہے اور اپنی بے وقوفی سے بے خبر بھی۔ چنانچہ بیگم کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان حضرت کی باتوں کو محض اس خیال سے سن کر خاموش رہ جاتی تھیں کہ جیسے کچھ بھی نہیں۔ بہرحال اپنے عزیز ہیں، ورنہ اس کی خوش گفتاری کا جواب تو صرف یہ تھا کہ صورت پہچانی نہ جاتی اور اگر بیگم ضبط اور شرافت سے کام نہ لیتیں تو جناب عرفان کا دونوں کانوں کے بیچ میں سر نظر نہ آتا۔ ہم کو ان کی باتیں سن سن کر بعض اوقات تو اتنی زور کی ہنسی آتی تھی کہ ضبط کرنا مصیبت ہوجاتا تھا۔ اب چونکہ شیلا صاحبہ آپ کی شریک حیات ہونے والی تھیں لٰہذا آپ کی جاسوسانہ رپورٹوں کا لب ولہجہ زیادہ بدلا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔ ”ارے آپا میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ وہ عورت اپنی ذات سے بہت نیک ہے۔ اگر وہ شرافت سے کام نہ لیتی اور اپنے ماں باپ کی عزت سے ذرا بھی غافل ہوتی تو ہمارے بھائی صاحب اب تک نہ جانے کیا کر چکے ہوتے۔“

بیگم نے اون کے گولے میں تیلی پیوست کرتے ہوئے کہا۔ ”گویا وہ بڑی شریف زادی ہیں، اور تمھارے بھائی صاحب بڑے کمینے ہیں۔“

عرفان نے سٹپٹا کر کہا۔ ”نہ نہ نہ، میرا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ یعنی میرا مطلب یہ تھا کہ میں نے اتنے دنوں میں شیلا کا بخوبی اندازہ کرلیا، اگر بھائی صاحب کی طرف سے زور نہ دیا جائے اور بھائی صاحب ہی اس کو گھیرے نہ رہیں تو اس کی طرف سے کوئی خاص توجہ کا سوال نہیں ہے۔“

بیگم نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ”یہ جناب کا اندازہ ہے نا لٰہذا اس کا غلط ہونا برحق ہے۔ میں نہ کلب کے حالات کو جانتی ہوں، نہ میں نے آج تک شیلا کی

صورت دیکھی ہے، نہ تمھارے بھائی صاحب نے مجھ سے کچھ کہا ہے، مگر تمھاری اس گفتگو کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تم وہاں جا کر اور سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد بھی کورے کے کورے ہو۔ اور تم سے زیادہ میں گھر بیٹھ کر ہی سمجھ چکی ہوں۔ ان مساۃ کا محض ”شوکی“ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو کس حد تک دلچسپی ہے۔“

عرفان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ہے۔“

بیگم نے اس تائید سے اور بھی جل کر کہا۔ ”اب آپ کہہ رہے ہیں یہ تو ہے...... اور ابھی جو آپ فرما رہے تھے وہ کیا تھا۔ ہزار مرتبہ تم سے کہا کہ تم خدا کے لیے کوئی رائے زنی نہ کیا کرو صرف جو حالات دیکھو وہ جوں کے توں بیان کر دو۔ مگر تم اپنی قابلیت سے مجبور ہو۔ حالات کم بتاتے ہو۔ رائے زیادہ دیتے ہو۔“

عرفان نے اپنے نزدیک بہت بڑی بات کہی۔ ”اچھا تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے اخباروں میں ایک تو ہوتا ہے نیوز ایڈیٹر (News Editor) اور ایک ہوتا ہے ویوز ایڈیٹر (Views Editor) تو گویا میں نیوز ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہوں۔“

بیگم نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، مقرر کیے گئے تھے مگر میں سوچ رہی ہوں کہ اب اس جگہ سے بھی برطرف کر دوں۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ تم نے آخر بی۔ اے۔ کا امتحان کیونکر پاس کر لیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جس سال تم پاس ہوئے ہو اسی سال ملک معظم کی تاجپوشی کے سلسلے میں ہر جیل سے پندرہ قیدی چھوڑے گئے تھے اور ہر یونیورسٹی سے پندرہ طالب علم رعایتی طور پر پاس کیے گئے تھے ورنہ تمھارے ایسے طالب علم کو جو یونیورسٹی بی۔ اے۔ کی ڈگری دے دے وہ تو اس قابل ہے کہ اس پر پیٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھا دی جائے۔“

عرفان نے بے غیرتی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ ”ارے آپا آپ کیا سمجھ سکتی ہیں کہ میں نے کس امتیاز کے ساتھ بی۔ اے۔ پاس کیا ہے۔ قسم خدا کی آج تک پروفیسر تعریف کرتے ہیں۔“

بیگم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”ذرا ان پروفیسروں کو کسی دن یہاں لے آؤ۔ حساب کا امتحان تو اسی وقت لے لوں گی۔ پچاس ماروں گی اور ایک گنوں گی۔ بات یہ ہے (تا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ آپ ہی کے پروفیسر تو ہیں نا۔ وہ پروفیسر جن کے شاگرد رشید کا عالم یہ ہے کہ ہونے والی سسرال کو پہلا ہی خط بھیجا تو لاہور بڑی ”ح“ سے لکھ دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ لاحول ولاقوۃ ایسے چغد کو ہم اپنی لڑکی نہیں دے سکتے۔“

عرفان نے بجائے جھینپنے کے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ کو یہ بات یاد خوب رہی حالانکہ انگریزی میں، میں نے بالکل صحیح املا لکھا تھا لاہور کا۔“

بیگم نے اس بے وقوف کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا تمھارا مطلب یہ ہے کہ انگریزی میں بھی بڑی ”ح“ سے لکھ جاتے لاہور۔“

عرفان غالباً اپنی حماقت کو سمجھ گیا اور ع

اب بھی سمجھے تو مہربانی کی

کہنے لگے۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ اچھا ہی ہوا جو وہاں شادی نہیں کی گئی۔ ورنہ یہ املا اور انشاء دیکھنے والے لوگ دامادوں سے عرائض نویسی کرانے لگتے ہیں۔“

بیگم نے ان کے اس لطیفے کو کچھ زیادہ توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔ ”پھر لطف یہ ہے کہ آپ کو ہنسی بھی آتی ہے۔ اس قسم کا آدمی جو اپنی بے وقوفی پر خود ہنسنے لگے نا قابل علاج مریض ہوتا ہے اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ مجھے بے وقوف کے ساتھ، خواہ وہ کسی عالم میں بھی ہو کبھی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ جاہل ہونا کوئی بری بات نہیں بلکہ ابو جہل تک ہو جانا غنیمت ہے، مصیبت یہ ہے کہ آپ کو آپ کی یونیورسٹی نے

سمجھا دیا ہے کہ آپ بی۔ اے۔ ہیں گویا بڑے عالم فاضل، مگر حال یہ ہے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ کودوں دے کر پڑھے ہیں یا کسی اور کے ڈپلومے پر اپنا نام لکھ لیا ہے، البتہ ایک بات ضرور ہے کہ ہو خوش نصیب آدمی وہ جو مثل ہے نا کہ خدا گدھے کو خشکہ دیتا ہے۔ یونیورسٹی سے تو خیر غلطی ہو ہی گئی تھی اب نہر کے محکمہ سے بھی یہی حماقت ہوئی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نہر بڑی ”ح“ سے لکھتے ہو یا چھوٹی ”ہ“ سے۔“

عرفان نے اپنے نزدیک گویا لطیفہ فرمایا۔ ”جی وہ تو نہر پر منحصر ہے، چھوٹی نہر ہوئی تو چھوٹی ”ہ“ سے اور بڑی ہوئی تو بڑی ”ح“ سے۔“

بیگم نے خوش ہونے کے بجائے جلتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ دونوں صورتوں میں بڑی ”ح“ والے احمق رہیں گے۔ اگر آپ پر ہی لوگوں کا بھروسہ نہ ہوتا تو حماقت کبھی بڑی ”ح“ سے نہ لکھی جاتی۔“

عرفان نے مبحث کو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر میری تقدیر تو ”حطی“ اور ”ہوز“ کے بیچ میں سے نکل گئی مگر اب تو سوال ہے بھائی صاحب کا۔ ان کے متعلق آپ کیا طے کرتی ہیں اور میرے لیے اب کیا حکم ہے۔“

بیگم نے لاپرواہی سے کہا۔ ”آپ ان کی فکر نہ کریں۔ وہ خود عاقل بالغ ہیں۔ اگر آپ محض کلب کی خبریں بغیر اپنی رائے زنی کے پہنچا سکتے ہیں تو شکریہ، ورنہ آپ سے کوئی شکایت تو ہو ہی نہیں سکتی۔“

عرفان نے کہا۔ ”یہ آج آخر بات کیا ہے کہ آپ کچھ مجھ سے خفا ہیں۔“

بیگم نے بچ بولتے ہوئے کہا۔ ”برا نہ مانو تو کہوں اور خوشامد نہ سمجھو تو تمھارے منہ پر کہہ دوں، تم ہو بے وقوف اور میں سب کچھ کر سکتی ہوں مگر کسی بے وقوف سے خوش نہیں رہ سکتی۔ قسمت نے تم کو بنا دیا ہے بھائی۔ اس لیے مجبور ہوں۔ ورنہ صاحب اختیار حاکم ہوتی تو شہر بدر کرا دیتی۔ تمھارا ایسا شوہر ملتا تو خودکشی کر لیتی۔ اگر ایسا مرشد ہوتا تو مرتد ہو جاتی مگر اب کروں تو کیا کروں۔ آپ واقع ہوئے ہیں بھائی، اور شرم آتی ہے مجھ کو جو کوئی تم کو دیکھتا ہے میرا بھائی بھی سمجھتا ہے اور بے وقوف بھی۔ حالانکہ تم بے چارے مجبور ہو۔ کوئی شخص اپنی ذاتی خوشی سے کبھی بے وقوف نہیں بنتا۔ بلکہ شاعر کی طرح بے وقوف پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز پڑھنے لکھنے یا سیکھانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا جس کو چاہے نواز دے۔ فرشتوں سے کچھ تو باقاعدہ مجسمے بنوائے گئے تھے اور کچھ فرصت کے اوقات میں دل بہلانے کے لیے انھوں نے کارٹون بنا لیے تھے۔ مقصد تھا ان کا آپس میں آپ کے ہیولے سے دل بہلانا۔ مگر غلطی سے دنیا کی طرف آنے والی بھیڑ میں آپ بھی چلے آئے اور یہ مصیبت نازل ہوئی اس خاندان پر۔“

عرفان نے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آج آپ کی طبیعت کچھ بہت زیادہ خوش معلوم ہوتی ہے اور اپنی ذہانت کا تختۂ مشق بنانا چاہتی ہیں آپ مجھے، لہٰذا میں تو آداب عرض کرتا ہوں۔“

بیگم نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنے اون کے گولے سے تیلی نکالی اور عرفان باہر نکل گئے۔

(۱۸)

فیاض صاحب سے آج کل ملاقات ذرا مشکل سے ہوتی تھی۔ دونوں گھروں کی شادی کے انتظامات اور بے چارہ اکیلا آدمی۔ لڑکی کے باپ بنے ہوئے تھے اور لڑکے کے بھی بزرگ۔ بمشکل تمام ایک روز شرفِ نیاز حاصل ہوا تو ہم نے ان کو دیکھتے ہی کہا ؎

تو اگر بھول گیا ہو تو تجھے بتلادوں
تیرے فتراک میں شاید کوئی نخچیر بھی تھا

کہنے لگے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
ہم تو آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

بات یہ ہے کہ اب کہیے تو آپ کی درباداری کروں یا آپ کے بدولت جو کام اپنے سر لے رکھا ہے اسے انجام تک پہنچاؤں۔ بڑے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں اس شادی میں۔ وہ جو چغد وقت ہیں نا آپ کے سالے صاحب ان حضرت نے معلوم نہیں کس کس سے اس بات کا ذکر کردیا ہے اور یہ خبر گشت کرتی ہوئی بھارتی صاحب تک پہنچ گئی۔ وہ بڈھا کہتا ہے کہ میں دولہا اور دولہن دونوں کو گولی ماردوں گا۔ دلہن تو خیر اپنے عشق کے سلسلے میں اپنے باپ کے ہاتھوں سے اس شہادت کے لیے اس لیے تیار ہے کہ اسے معلوم ہے کہ بھارتی صاحب کے پاس بندوق کا لائسنس نہیں ہے۔ مگر عرفان نے جب سے یہ سنا ہے ان کا دم نکلا جاتا ہے کہ کہیں بھارتی صاحب بغیر بندوق ہی کے ان کو گولی نہ ماردیں۔ لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں کہ برخوردار اس قسم کے معاملات میں اس قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیلیٰ کے باپ نے تو مجنوں کے لیے نہ معلوم کتنے آدمی مقرر کررکھے تھے کہ جہاں ملے پکڑ کر خوب ٹھوکو۔ مگر وہ لیلیٰ کے عشق سے باز نہ آیا اور آپ ہیں کہ اس سے پہلے ہی جلاب میں مرے جاتے ہیں۔ مگر صاحب وہ کچھ ایسا ڈر گیا ہے کہ آج کل دریا کے کنارے والی سڑک سے گھوم کر کلب آتا ہے کہ کہیں راستہ میں بھارتی صاحب کی گولی اس کے انتظار میں ٹہل نہ رہی ہو۔ شیلا کی مستقل مزاجی دیکھئے کہ بھارتی صاحب نے جب ان سے پوچھا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ۔ ”جی ہاں یہ قصہ بالکل سچا ہے اور اگر آپ نے مخالفت کی تو بھی میں عرفان سے وعدہ کرچکی ہوں۔ اپنے وعدہ پر قائم رہوں گی۔ اس لیے کہ لڑکی ایک مرتبہ جذباتی طور پر کسی کی ہوتی ہے اور پھر زندگی بھر اسی کی رہتی ہے۔“ بھارتی صاحب نے اس کو ہر طرح ڈرایا دھمکایا۔ ناچے کودے، چیخے چلائے، گھر سر پر اٹھا لیا۔ مختصر یہ کہ جو کچھ اس بڑھاپے میں کرسکتے تھے کر گذرے۔ مگر شیلا جہاں تھی وہیں رہی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود مجھ کو بھارتی صاحب کے پاس جانا پڑا۔ آدمی ذرا کارآمد قسم کا بے وقوف ہے۔ میں نے ان کو تمام نشیب و فراز سمجھانے کے بعد اس حد تک راضی کرلیا کہ وہ عرفان کو ملنا چاہتے ہیں۔ اس کا بھی خیال ٹھیک ہے۔ کہتا یہ ہے بڈھا کہ صاحب مجھے نہ مذہبی اختلاف کی فکر ہے نہ مجھے اس سے کوئی بحث کہ وہ لڑکا کس قسم کا ہے مگر یہ بات اگر بالکل مناسب تھی تو آخر مجھ سے چھپائی کیوں گئی۔ چھپائی تو وہ چیز جاتی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے نامناسب ہو۔ بہر صورت میں نے ان بڑے میاں پر اپنا عملِ تسخیر پڑھ کر پھونک دیا ہے اور آج تین دن سے وہ عرفان سے ملنے کے منتظر ہیں۔ مگر اب عرفان کو کون سمجھا۔ ان کا دم نکلا جاتا ہے۔ میں چاہتا

ہوں کہ اس وقت تم مل گئے ہو تو ہم دونوں مل کر عرفان کو بھارتی صاحب کے پاس لے چلیں۔ عرفان یہیں کلب میں موجود ہے۔ میں اس کو لاتا ہوں تم یہیں انتظار کرو۔“

یہ کہہ کر فیاض گئے اور الٹے پیروں عرفان کو لے کر واپس بھی آ گئے۔ ہم غالباً کچھ سوچنا چاہتے تھے مگر اتنی مہلت ہی نہ مل سکی۔ گھنٹہ بھر تک ہم دونوں عرفان کو سمجھاتے رہے اور وہ حضرت اس طرح اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ جیسے بکری قصائی۔ سے بھاگتی ہے۔ بمشکل تمام ان کے کانپتے ہوئے جسم کو سنبھالتے ہوئے اور دھڑکتے ہوئے دل کو تھامے ہم لوگ ان کی ہونے والی سسرال تک پہنچے۔

بھارتی صاحب نے بڑی زور سے ڈانٹا۔ ”آداب عرض“ اور عرفان صاحب جہاں تھے وہیں رہ گئے۔

فیاض نے عرفان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”بھارتی صاحب آپ ہی ہیں مسٹر عرفان، لکھنؤ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور نہر کے محکمہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار۔“

بھارتی صاحب نے عینک لگا کر عرفان کی طرف دیکھا اور ایک منٹ تک مسلسل دیکھنے کے بعد اب جو بڑھے ہیں وہ اپنا سگار اٹھانے تو عرفان سمجھا کہ نشانہ باندھ چکے ہیں بندوق اٹھا رہے ہیں۔ الوداعی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ زیرِ لب کچھ کہنے کی کوشش کی۔ غالباً کلمہ شہادت پڑھا ہوگا مگر بھارتی صاحب نے اس عرصہ میں اپنا سگار سلگا کر اس خطرے کو دور کر دیا۔ یعنی فی الحال عرفان کی آئی ہوئی ٹل گئی۔ بھارتی صاحب نے سگار کے دو خوفناک کش لیتے ہوئے کہا۔

”جی! تو مسٹر عرفان آپ میری لڑکی شیلا کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

عرفان نے سوچا کہ مرتے وقت جھوٹ نہ بولا جائے۔ بڑی جرأت سے کام لے کر کہہ گزرے۔ ”جی...... وہ...... یعنی...... گویا...... میرا مطلب یہ...... کہ...... جی ہاں۔“

بھارتی صاحب نے ان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیوں؟ آخر کیوں؟ یعنی کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ تو خیر عرفان تھے۔ لیکن یہ سوال اگر دنیا کا کوئی خسر اپنے ہونے والے داماد سے کہے تو شاید کوئی داماد بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو صاف صاف یہ بتا سکے کہ وہ شادی کرنا کیوں چاہتا ہے۔ چنانچہ بے چارہ عرفان بھی گڑبڑا کر رہ گیا۔ مگر بھارتی صاحب نے اپنے سوال کی خود تشریح کرتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی بنانے کے لیے میری لڑکی یعنی شیلا کا انتخاب کسی خاص وجہ سے کیا ہوگا اور وہ خاص وجہ غالباً آپ محبت کو بتائیں گے جس کو میں ایک قسم کی بے ہودگی کے علاوہ خاص اور کوئی درجہ نہیں دیتا۔ بے ہودگی میں اس لیے کہتا ہوں کہ شیلا کی ماں سے پہلے میں نے ایک لڑکی سے محبت کی۔ اس کی اس محبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے گویا شادی کرنا پڑی اور شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محبت ختم ہو گئی۔ پھر رنجشیں شروع ہوئیں۔ لڑائیاں ہوئیں۔ دو سال تک زندگی وبال رہی اور آخر مجھے طلاق دینا پڑا۔ شیلا کی ماں کے ساتھ میں نے ڈر کے مارے شروع سے لے کر آج تک کبھی محبت نہیں کی۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں اب تک زندہ ہیں۔ وہ بیوی ہیں اور میں میاں، ہم لوگوں کے دو لڑکیاں ہیں ایک یہ شیلا اور اس سے بڑی کملا۔ بڑی لڑکی محبت میں مبتلا کر تین سال ہوئے ایک انجینئر سے شادی کر چکی ہے اور ہم لوگ ہر وقت اس انتظار میں ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کب طلاق کی نوبت پہنچتی ہے۔ وہی صورت شیلا کے سلسلے میں پیش آنے والی ہے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسٹر عرفان آپ شیلا سے آخر کیوں شادی کر رہے ہیں۔“

بھارتی صاحب کے اس بیان پر ہم اور فیاض دونوں حیران تھے۔ عرفان بے چارے کس کھیت کی مولی ہیں۔ اس سوال پر انھوں نے پہلے ہم کو اور فیاض کو دیکھا تو

فیاض نے ان کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''بھارتی صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ دونوں کو قدرتی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر مناسبت ہے کہ ان دونوں کی یہ خواہش، خواہ آپ اس کو محبت کہیے یا کچھ کہ ان دونوں کی آپس میں شادی ہو جائے۔ ایک قدرتی قسم کا مطالبہ ہے اور ہم سب کا فرض یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔''

بھارتی صاحب نے عینک کی اوٹ سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مگر میں نہ طبیعتوں کی مناسبت کا قائل ہوں، نہ میرے نزدیک اس کا کوئی اثر زندگی پر پڑتا ہے۔ میری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ شیلا کی ماں ہمیشہ سے بہت ہنس مکھ قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ بہت باتونی بھی ہیں اور قدرتی طور پر ذرا انتہائی پسند اور سنجیدہ قسم کا آدمی ہوں۔ میری زندگی کا ریکارڈ یہ ہے کہ ایک مرتبہ بھی بلا با ضرورت نہیں ہنسا۔ وہ مرچ زیادہ کھاتی ہیں اور میں نمک زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ان کو کچے گانے پسند ہیں۔ اور میں ''شدھ گائیکی'' کا دلدادہ ہوں۔ وہ شراب سے بے حد نفرت کرتی ہیں۔ اور میں اپنی زندگی میں اس دن کو شامل ہی نہیں سمجھتا۔ جس کی شام کا آفتاب غروب ہونے کے بعد میرے لیے ایک جام طلوع نہ کرے۔''

فیاض نے خوشامد کا بڑا عمدہ موقع دیکھ کر کہا۔ ''سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ زبان اور شاعرانہ بیان ہے۔''

بھارتی صاحب نے جلدی سے کہا۔ ''نہ نہ نہ، اگر یہ شاعرانہ بیان ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے شاعری سے تو بے حد نفرت ہے۔ بلکہ میرے ایک کرایہ دار تھے۔ جب میں نے ان کی سائن بورڈ پر ان کا تخلص دیکھا تو فوراً ان کو نوٹس دے دیا کہ اب مکان خالی کر دیجیے۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ مجھ کو اپنی غزل سنا دی اس دن کے بعد سے وہ جب کبھی آتے ہیں تو میں اندر ہی سے کہلوا دیتا ہوں کہ بھارتی صاحب نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ جناب خدا آپ کا بھلا کرے۔ میں ایک مشاعرہ میں پھنس گیا تو صاحب مجھے اختلاج ہونے لگا۔ یہاں تو درجنوں شاعر ہیں۔ اب اگر کسی محفل میں جاتا ہوں پہلے تحقیقات کر لیتا ہوں کہ یہاں وہ بات تو نہیں ہونے والی جس کو شاعری کہتے ہیں۔''

فیاض نے موقعہ مناسب سمجھ کر کہا۔ ''یہ عجیب اتفاق ہے۔ ہمارے عرفان صاحب کو بھی شاعری سے ایسی ہی نفرت ہے۔''

بھارتی صاحب نے بڑی زور سے کہا۔ ''جی اب آپ کو شاعری سے نفرت ہے؟ یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ اگر آپ کو شعر و سخن سے دلچسپی ہوتی تو میں یہ سمجھ سکتا کہ آپ میری لڑکی شیلا سے شادی کرنے کے بعد اس کے ذوقِ شعری کو تسکین دے سکیں گے۔ وہ اس معاملے میں بالکل میری ضد واقع ہوئی ہے۔ بلکہ میرے اور اس کے درمیان جو سب سے بڑا اختلاف ہے وہ یہی ہے۔ خیر باپ بیٹی کا اختلاف ہی کیا، لیکن میاں بیوی کے درمیان یہ اختلاف ہوتا تو دونوں کی زندگی تباہ کر دے گا۔ شاعری سے مسٹر عرفان کی یہ نفرت بڑی اچھی چیز تھی بشرطیکہ یہ میرے ساتھ شادی کے امیدوار ہوتے۔''

ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی تو بھارتی صاحب نے بدستور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''نہ نہ نہ، ہنسی کی بات نہیں بلکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس پر غور کیجیے۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ دونوں کی طبائع ملتے جلتے ہیں لیکن یہ تو بہت بڑا اختلاف ہے۔''

فیاض نے بیٹھے بٹھائے یہ نئی مصیبت مول لے لی۔ خوشامد میں ایک بات کہہ گئے اور اب بڑے میاں سے جان چھڑائے نہ چھوٹتی تھی۔ آخر ہم نے فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں فیاض صاحب آپ کا یہ خیال کچھ درست نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان تو خوب شعر و ادب کی گفتگو رہتی ہے۔''

بھارتی صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ”گفتگو دوسری چیز ہے۔ ممکن ہے کہ گفتگو یہی ہوتی ہو کہ وہ کہتی ہو کہ مجھے دلچسپی ہے اور یہ کہتے ہوں کہ میں بیزار ہوں۔ شروع شروع میں تو شباب کی ارمان انگریزیوں کی وجہ سے یہ اختلاف جذبات کے پربت کے سامنے رائی نظر آتا ہے۔ لیکن جب شادی ہوجائے گی۔ ارمان پورے ہوچکیں گے تو اختلاف ہوگا پربت اور جذبات ہوں گے رائی۔ کیا سمجھے آپ؟ سگریٹ پیجئے گا یا کچھ اور منگاؤں؟“

فیاض نے کہا۔ ”کافی ہے۔“

بھارتی صاحب نے جلدی سے کہا۔ ”کافی تو غالباً نہ ہوگی چائے منگا سکتا ہوں۔“

فیاض نے جلدی سے کہا۔ ”جی نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ سگریٹ ہی کافی ہے۔“

بھارتی صاحب نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”کافی بمعنی بہت، اس کی جمع کیا ہے عرفان صاحب۔“

عرفان نے زندگی بھر میں شاید پہلی ذہانت کی بات گھبرا کر غلطی سے کہہ دی۔ ”کافی کی جمع کیا ہوسکتی ہے؟ جمع تو بہت سی چیزوں کو کہتے ہیں اور کافی کے معنی خود بہت کے ہیں۔“

بھارتی صاحب نے خوش ہوکر کہا۔ ”بہت خوب، بہت خوب۔ آپ کی غالباً اسی قسم کی کوئی بات شیلا کو پسند آگئی ہوگی۔ یہ ٹھیک ہے۔ میری رائے میں آپ ضرور شادی کر لیجئے۔ مگر میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے شادی کے فلسفے پر غور بھی کیا ہے یا محض شادی کر رہے ہیں۔“

عرفان اس وقت معلوم نہیں کس غیبی امداد کے ماتحت بول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”غور تو میں نے نہیں کیا۔ اس لیے کہ جب تک شادی کا اتفاق پیش نہ آئے غور آخر کیونکر ہوسکتا ہے۔ غور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس چیز پر غور کیا جارہا ہو وہ کم سے کم نگاہوں کے سامنے نہیں تو خیال کے حدود میں ضرور ہو۔ ابھی تو میں نے اپنی موجودہ زندگی پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کرلوں۔ اب شادی کرنے کے بعد......“

بھارتی صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ”شادی کرنے کے بعد یہ غور کروں گا کہ اب کیا کروں گویا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مگر یہ تو میں شعر پڑھ گیا۔ عمر کی وجہ سے دماغ اس قدر ماؤف ہوچلا ہے کہ بے ساختگی میں شعر تک پڑھ جاتا ہوں۔ تو خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ لوگ تاریخ وغیرہ طے کرنے کے بعد مجھ کو اطلاع دے دیجئے گا تا کہ میں اپنے پروگرام میں اس تقریب کو لکھ لوں۔ اور ہاں ہفتے کے دن ایک بجے کے بعد یا اتوار کے دن یہ اطلاع نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے بنک بند ہوجاتا ہے اور میں اس موقع پر ایک حقیر رقم اپنی لڑکی کو دینا چاہتا ہوں۔ میں چیک دے دیتا۔ مگر ممکن ہے کہ رعشہ کی وجہ سے دستخط میں کچھ اختلاف ہوجائے اور آپ میرے لیے کوئی غلط رائے قائم کرلیں۔ اب آپ حضرات جاسکتے ہیں اور جس دن آپ کا جی چاہے اور آپ میرے یہاں کھانے پر آنا چاہیں تو میرے خانساماں کو اطلاع دے دیجئے گا۔ آداب عرض۔

(۱۹)

کلب میں آج کل ہر طرف عرفان اور شیلا کی شادی کے چرچے تھے مگر پھر بھی احتیاط یہ برتی جا رہی تھی کہ کلب سے باہر یہ ذکر نہ جائے۔ عرفان کو تو اپنے باپ کا ڈر تھا لیکن فیاض کو عرفان کے باپ سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ اگر یہ اطلاع عرفان کے والد کو پہنچی تو پھر بیگم تک یہ خبر ضرور پہنچ جائے گی اور ان کو خبر پہنچنے کے معنی تھے کہ گویا سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ فیاض اس سلسلے میں ہر ممکن احتیاط برت رہے تھے اور چونکہ کلب کے ممبر بھی ہمارے ہمراز تھے لہٰذا ان کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہ تھا البتہ خود دولہا میاں اس قدر نامعقول ہوئے تھے کہ خود ان کی طرف سے قدم قدم پر اندیشہ تھا کہ نامعلوم یہ کیا کہہ گزریں۔ اور کہیں ڈر کے مارے گھر ہی میں کسی سے انکشافِ راز فرما دیں۔ جہاں تک ہو سکتا تھا ان کو سمجھانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی اور بھارتی صاحب کے یہاں کے قصے کی وجہ سے کچھ ان کے بھی کان ہو گئے تھے کہ ان کے حمق کی وجہ سے اس قصے نے بلاوجہ بھارتی صاحب تک طول کھینچا۔ آج کلب کے ممبروں میں تیل ماش کی تقریب تھی۔ مقصد یہ تھا کہ عرفان بھارتی صاحب کے یہاں جا کر زندہ واپس آ گئے ہیں تو کچھ نذر اتار دی جائے۔ رمیش نے واقعی تیل ماش کا انتظام کیا تھا۔ اخلاق پھولوں کے گجرے لائے تھے۔ شعیب نے اس تقریب کے لیے نظم کہی تھی۔ عرفان نے لاکھ اس موقعہ پر بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے اس کو گھیر کر بٹھا ہی لیا۔ اس کو روکنے والوں میں شیلا بھی شامل تھیں اور وہ عرفان سے برابر

کہے جاتی تھیں کہ تم اپنے دوست کو بے وقوف ثابت کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ دوست ہی آپس میں مذاق نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ مجھ کو دیکھو کہ تمھاری وجہ سے میرا بھی مذاق اڑتا ہے۔ مگر میں تو اس طرح رسیاں نہیں تڑاتی۔ بہر صورت شیلا نے اور باقی سب نے سمجھا بجھا کر عرفان کو احباب کے مجمع میں پہنچا دیا اور اس تقریب کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے فیاض نے کھڑے ہو کر باقاعدہ ایڈریس اس بہادر سپاہی کی خدمت میں پیش کیا جو مردانہ وار اپنے خوفناک خسر کے سامنے سر سے کفن باندھ کر گیا اور اس میدانِ کارزار سے بھاگنے کی بجائے سرخرو سرفراز واپس آیا۔ ایڈریس میں ان تمام کارناموں کا ذکر تھا جو اس جانباز سپاہی نے بھارتی صاحب کے یہاں پیش کیے۔ نہ یہ سورما ڈرا، نہ سہما، نہ جھجکا، نہ جھپکا، بلکہ موت سے جس استقلال کے ساتھ کھیلا ہے اس کے صلہ میں ملنا تو چاہیے تھا وکٹوریہ کراس، مگر فی الحال اسے شیلا ملنے والی تھی۔ اس ایڈریس کا لطف یوں تو سبھی نے حاصل کیا، مگر سب سے زیادہ شیلا لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایڈریس کے بعد شعیب نے اپنی نظم پڑھی ؎

اے میرے ممدوح اے عرفا اے غازی جواں
تجھ سے کچھ سمجھیں گی شیلا اور کچھ اللہ میاں
اب کہاں بنتے ہیں ایسے لوگ ایسے جانور
یہ نمونے جن میں ڈھلتے تھے وہ سانچے ہیں کہاں
آپ ہیں فخرِ حماقت آپ جانِ ابلہی
بے وقوفی کی ہے زندہ آپ ہی سے داستان
آپ کے سر میں حماقت کے ہیں کیڑے اس قدر
کھوپڑی میں دیکھیے تو ہے بساطِ کہکشاں

ابلی پڑتی ہے حماقت آپ کی ہر بات پر
بے وقوفی کا جو سچ پوچھو تو ہے دریا رواں
عقل کے شرمندۂ احساں نہیں بنتے حضور
عقل والے کر چکے ہیں یہ بھی سعیِ رائگاں
چلتی پھرتی اک حماقت ہے کہ پیکر آپ کا
عقل کے حق میں ہیں گویا آپ مرد ناگہاں
اس حماقت کے لیے یہ وسعتیں محدود ہیں
پاؤں کے نیچے زمیں ہے سر کے اوپر آسماں
ڈاکٹر اقبال کا جب سے سنا ہے مشورہ
ڈھونڈتے تھے اپنے دل کے واسطے اک پاسباں
آپ کو شیلا ملیں شیلا کو عرفاں مل گیا
فیصلہ دشوار ہے کیا سود ہے کیا ہے زیاں
معرکہ سسرال کا سر کرکے آتے ہیں حضور
زندگی ثابت ہوئی سمجھے تھے مرگِ ناگہاں
اب عقیدت کیا ادا کر پاؤ گے تم اے شعیب
کاش اس کو بھی سمجھ لیں وہ حسابِ دوستاں

اس نظم کے بعد اخلاق نے اٹھ کر عرفان کو ہار پہنائے اور رمیش نے تیل ماش دکھا کر کلب کے چپڑاسی کو دے دئے۔ کلب کے سیکرٹری کی حیثیت سے اخلاق نے کہا۔

”حضرات اس تقریب کے موقعے پر کلب کی مجلس عاملہ کی انتہائی خواہش تھی

کہ جناب ممدوح کو چاندی اور سونے میں تولا جائے مگر کلب کی مالی حالت نے اس بات کی اجازت نہیں دی۔ یہ صورت بھی ممکن ہو جاتی۔ بشرطیکہ کلب کے ممبروں کے ذمے چندے کی کافی رقم واجب الادا نہ ہوتی۔ خود جناب ممدوح کی طرف بیاسی روپے نکلتے ہیں۔ بہرصورت چونکہ اس رسم کا نہ ہونا ایک قسم کی بدشگونی ہے، لہٰذا آپ کو اخبارات کے پرانے فائلوں سے تولنے کی تجویز میں پیش کرتا ہوں۔“

اس تجویز کی یوں تو سب نے تائید کی مگر شیلا نے اس کو پسند نہ کیا اور یہ کہہ کر اس مذاق کو ختم کر دیا کہ ”بس ہر بات کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔“ لہٰذا جلسے کی کارروائی ختم کر دی گئی۔ مگر جلسے کے بعد بھی عرفان کا بھارتی صاحب کے یہاں جانا ایک خاص موضوع بنا رہا۔

فیاض نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”خیر یہ تو مذاق تھا۔ مگر میں واقعی حیران ہوں کہ عرفان میں بھارتی صاحب کے سامنے پہنچ کر کس قیامت کی قوتِ گویائی اور کس بلا کی حاضر جوابی پیدا ہو گئی تھی۔ یعنی اخلاق تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس نے کیسے کیسے جواب ان کو دیئے ہیں۔“

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ ”صاحب ان کے جوابات سے زیادہ ان کے سوالات پر حیران ہوں کہ کیا کیا باتیں ان کو سوجھ رہی تھیں مثلاً ایک دم سے کافی کی جمع پوچھ بیٹھے۔“

شیلا نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ”ارے ان کی باتیں آپ نے ابھی سنی کہاں ہیں۔ وہ تو بات کرتے میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جایا کرتے ہیں۔ آج ہی آپ لوگوں کا قصہ بیان کرتے کرتے ایک دم سے کہنے لگے کہ عرفان کا نام کیا ہے، میں نے ان کو بمشکل تمام سمجھایا کہ عرفان کا نام عرفان ہی ہے۔ یہ بات ان میں کچھ عمر کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ہمیشہ سے یہی حال ہے۔“

رمیش نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ کہیے کہ یہ جو آپ میں اور آپ کی گفتگو میں اکثر بے ربطی کے کمالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کا نسلی اور خاندانی امتیاز ہے۔“

شیلا نے رمیش کی طرف تیوریوں پر بل ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور جناب کا نسلی امتیاز غالبًا یہ طعن اور طنز ہے۔ میں تم سے کل سے جلی ہوئی بیٹھی ہوں رمیش کہ برا تو مانیں آپ میری بات پر اور غصہ اتاریں بے چارے عرفان پر، گویا دھوبی کے بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھے۔“

رمیش نے تڑپ کر کہا۔ ”اے سبحان اللہ! کیا بات کہی ہے۔ سن رہے ہیں جناب عرفان! شادی کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ مگر آپ کے متعلق یہ طے ہو گیا کہ آپ گدھے ہیں۔“

فیاض نے ایک دم سے چونک کر کہا۔ ”ارے بھائی یہ قصہ چھوڑو۔ شادی کی تاریخ کا طے ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔“

ہم نے مشورۃً عرض کیا۔ ”میرا خیال یہ ہے کہ بھارتی صاحب ہر چند کہ غیر متعلق بن کر رہ گئے مگر ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم تاریخ انھیں سے طے کرائیں۔ انھوں نے کہا تا کہ ہم لوگوں کا جس دن جی چاہے ان کے خانساماں کو اطلاع دے کر کھانے پر جا سکتے ہیں۔ لہٰذا آج خانساماں کو خط لکھئے کہ کل ہم لوگ کھانے پر آ رہے ہیں اور کل ہی یہ تاریخ انھیں کے مشورے سے طے پا جائے۔“

فیاض نے اس رائے کی تائید کی مگر یہ بات چونکہ قابلیت کے خلاف تھی کہ کسی رائے کی معقولیت کو وہ ایک دم سے تسلیم کر لیتے لہٰذا کچھ غور کرنے کے بعد بولے۔ ”رائے تو آپ کی ٹھیک ہے مگر آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا ہے کہ ہم کو پہلے آپس میں ایک تاریخ طے کر لینا چاہیے، اس کے بعد اسی تاریخ کے متعلق ان سے مشورہ

کر لیں گے۔ ورنہ اگر ہم نے ان سے پوچھی تاریخ اور انھوں نے یہ کہہ دیا کہ اب کی ۲۸ر دسمبر کو کون سی تاریخ ہو گی۔ یا یہ فرما گئے کہ جمعہ کس دن ہے تو بتائیے ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہو گا۔“

شیلا اپنے والد محترم کے متعلق یہ باتیں سن سن کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ آخر انھوں نے کہا۔ ”آپ خود تاریخ طے کیجئے۔ ان کو اس جھگڑے میں نہ ڈالئے ورنہ وہ معلوم نہیں کیا کیا الجھنیں پیدا کر کے آپ کے پروگرام کو ایسا گڑبڑ کریں گے کہ آپ کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکے۔“

رمیش نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”ہائے کمبختی، کیا زمانہ آ لگا ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں جو اپنے بیاہ کی بات میں پڑ پڑ بول رہی ہیں۔“

شیلا نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”مجھے معلوم تھا یہاں رمیش خالہ بیٹھی ہیں۔“

رمیش پر چپک کر رہ گئی اور سب نے اتنے قہقہے بلند کیے کہ رمیش بدحواس ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے اس سے جس جس نے بات کی خالہ کہہ کر کی۔

(۲۰)

نازو اور رفو کی جو کانفرنسیں ہو رہی تھیں ان میں کبھی کبھی معلم الملکوت یعنی فیاض صاحب بھی شامل ہوا کرتے تھے اور جس کانفرنس میں ان کی شرکت کی اطلاع ہم کو ہو جاتی تھی اس کا تماشہ دیکھنے کے لیے ہم ضرور گھر پر موجود رہتے تھے اور اس کمرے سے جہاں بقول بیگم کے ایک سے ایک قد آدم چوہا بھرا پڑا تھا اس کانفرنس کی سیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آج بھی فیاض صاحب تشریف لائے ہوئے تھے اور کانفرنس کے اجلاس میں بڑے معرکہ کی تقریر فرما رہے تھے۔ یہ تقریر کچھ عرفان کے متعلق زیادہ تھی۔ ہم نے، افسوس یہ ہے کہ پوری تقریر نہیں سنی۔ البتہ جس وقت ہم پہنچے ہیں وہ کہہ رہے تھے۔ “حیرت ہوتی ہے بھابی یہ عرفان آپ کے بھائی ہیں کیونکر۔ آپ ماشاءاللہ ایک برق بلا بقول شخصِ کاٹے کا منتر نہیں۔ ایسی ایسی باتیں کہتی ہیں کہ غیرت دار پانی نہ مانگے اور ایک وہ ہیں چغد صحرائی کہ ایک گھنٹہ جس کسی سے باتیں کر لیں ایک مہینہ تک ذہانت اس کے آس پاس نہیں آسکتی۔ ارمان رہ گیا کہ کبھی تو کوئی سمجھ داری کی بات کی ہوتی۔ مگر جب کہتے ہیں، ایک ایسی سڑی ہوئی بات کہتے ہیں کہ سن کر ہنسنے اور سمجھ کر رونے کو دل چاہتا ہے۔ اپنے محکمہ میں بھی نیک نام ہو رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک چوکیدار کو، جس نے پچھلے مہینے یہ درخواست دی تھی کہ میرا باپ مر گیا ہے جنازے میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ کل یہ حکم دیا ہے کہ شرکت کر سکتے ہیں۔ محکمے کے کلرک اس حکم کو لیے لیے پھرتے ہیں اور ایک ایک کو دکھاتے ہیں کہ یہ

ہے ہمارے افسرِ اعلیٰ کا کارنامہ۔”

بیگم نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ “یہ آپ کی تصنیف ہے یا واقعی ایسا ہوا ہے۔ ان کی عقل مندی سے تو خیر کچھ بعید نہیں مگر آپ بھی تو ماشاءاللہ بہت بڑے منصف ہیں۔”

فیاض نے سنجیدگی سے کہا۔ “نہیں صاحب یہ میری تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ قصہ اصل میں یہ ہے کہ آپ کے بھائی صاحب کے کچھ کاغذات کہیں دبے رہ گئے تھے، وہ جو برآمد ہوئے تو آپ نے سب پر یکمشت حکم لکھنا شروع کر دیا۔ انھیں میں یہ درخواست بھی تھی لہٰذا یہ بغیر حکم کے کیسے رہ جاتی۔ خیر یہ تو جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو وہ جانیں اور ان کا کمبخت محکمہ، مگر آپ نے جو خدمت ان کے سپرد رکھی ہے اس کے متعلق مجھے خود آپ سے بدعقیدگی پیدا ہو رہی ہے کہ آخر کیا سمجھ کر آپ نے ان کو اس خدمت کا اہل سمجھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کیا کر رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ خود شیلا سے پوچھا کرتے ہیں کہ کہیے کب ہو رہی آپ کی شادی اور وہ بھی اکیلے میں۔ جب کلب کا کوئی مردانہ ممبر آس پاس نہ ہو۔ شیلا بھی یہ سمجھتی ہے کہ چلو ایک سے دو بھلے۔ اب تک تو بے چاری اکیلی عورت تھی وہاں اب آپ کے بھائی صاحب نے کمی کو پورا کر دیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن وہ آپ کے شوہر نامدار سے اپنا تعارف نہ کرا بیٹھیں کہ آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔ میں آپ کا رشتہ دار ہوں۔”

بیگم نے گھبرا کر کہا۔ “کہیں ایسا غضب بھی نہ کریں ورنہ سارا بھانڈا ہی پھوٹ جائے گا۔ اتنا تو خیر میں بھی جانتی ہوں کہ وہ صرف بے وقوف ہی نہیں بلکہ پرلے سرے کے لپاٹیے بھی ہیں۔ جھوٹ عبادت سمجھ کر بولتے ہیں اور اپنی حماقتوں کی طرف سے اس قدر مطمئن ہیں کہ گویا یہ ان کا پیدائشی حق ہے۔ مختصر یہ کہ ان کو ڈانٹیے تو انگوٹھا چوسنے لگتے۔ ہیں۔ وہ تو کہیے چچا اشفاق کو جن کی بدولت نوکری مل گئی۔ ورنہ یہ

تو اس قابل تھے کہ کسی زنانے اسکول میں استانی کے طور پر رکھ لیے جاتے۔“

فیاض نے اپنی بیوی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری بیگم صاحبہ کو وہ بہت زیادہ پسند ہیں۔ فرماتی ہیں بڑی بھولی باتیں کرتا ہے۔“

نازو نے چمک کر کہا۔ ”پھر آپ جھوٹ بولے۔ کب کہا تھا میں نے۔“

فیاض نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھائی پرسوں ہی کا تو ذکر ہے کہ تم کہہ رہی تھیں۔ بے چارہ سیدھا آدمی ہے۔ اس کی باتوں میں گھماؤ پھراؤ نہیں ہوتا۔“

نازو نے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں انھیں پسند کرتی ہوں۔ ارے مجھے اگر کسی کو پسند کرنا ہوتا تو سب سے پہلے تو تمھیں کو پسند کرتی۔“

فیاض نے ایک دم سے کھڑے ہو کر کہا۔ ”سنا بھابی آپ نے غالب کے قسم کا شعر، کہا ہے اس عورت نے یعنی مطلب یہ ہوا اس شعر کا شاعر کہتا ہے کہ میں تم کو پسند نہیں۔ کس قدر فصاحت اور بلاغت کے ساتھ شاعر نے اپنے محبوب کو قابلِ نفرت ٹھہرایا ہے۔“

نازو نے جل کر کہا۔ ”محبوب نہیں، تو وہ۔“

فیاض نے پیار کی نظروں سے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو خیر ہم ہیں ہی تمھارے مگر تم بھی بڑی وہ ہو۔ تمھیں مار کے ٹکڑے کر دوں۔ بھابی یہ شعر سنا ہے نا آپ نے کہ ”تم بڑے وہ ہو تمھیں مار کے ٹکڑے کر دوں“ اس کا پہلا مصرعہ میں آپ کو تو سنا نہیں سکتا ان کو البتہ گھر جا کر سنا دوں گا۔“

نازو نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا واہیات، تمھاری زبان کے آگے تو روز بروز خندق ہوتا جا رہا ہے جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہو۔“

فیاض نے کہا۔ ”ارے بیگم صاحب نہ ہوا میں ان کے میاں کی طرح کا کہ خود

تو کلب میں گل چھرے اڑاتا اور آپ بجائے اس ڈانٹ ڈپٹ کے میری ایک نگاہِ التفات کے لیے نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں کرتیں۔“

بیگم ے غالباً اس گفتگو سے عاجز آ کر کہا۔ ”آپ لوگوں کی لڑائی کے مارے تو اور ناک میں دم ہے۔ میں نہ جانے کیا کیا آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کو اپنے آپس ہی کے جھگڑوں سے فرصت نہیں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے تو کسی دن دکھایئے اپنی ہونے والی بھاوج کو۔“

فیاض نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”نہ صاحب یہ جھوٹ ہے۔ نہ میرے سر میں اتنے بال ہیں کہ آپ کے شوہر نامدار کی اس سلسلے میں چپتیں کھاؤں اور نہ دراصل آپ کا یہ مطالبہ درست ہے۔ آپ آخر اسے کیوں دیکھنا چاہتی ہیں، محض جلنے کے لیے، اپنے کو کڑھانے کے لیے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ کو جلانے اور کڑھانے کے لیے۔ آپ کے میاں کا طرزِ عمل کافی نہیں ہے۔“

بیگم نے کہا۔ ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات ایک قدرتی سی ہے کہ اپنے حریف کو دیکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔ اچھا ایک بات بتایئے کہ میرا بھی اس سلسلے میں کبھی ذکر کرتے ہیں۔“

فیاض نے بڑا اثر کرنے والا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ سے دراصل وہ ڈرتا بہت ہے اس زمانے میں موت سے ڈرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ خدا سے ڈرنے والے تو خدا کے فضل سے اب پیدا ہی نہیں ہوتے۔ بہت عرصہ ہوا اس قسم کے لوگ پائے جاتے تھے جن کا ذکر اب پرانی کہانیوں میں تو ملتا ہے مگر دیکھنے میں یہ لوگ نہیں آتے۔ اس قحط الرجال کے زمانے میں بیوی سے ایسا ڈرنے والا آدمی مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ اور میرے نزدیک ایک شریف آدمی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ بیوی سے ڈرتا ہو۔ کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکا

ہے کہ میں رفو کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جو غلطی ہونا تھی وہ تو خیر ہو چکی۔ مگر اب اس کا اظہار میرے لیے ایک پہاڑ بنا ہوا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح عبور کیا جائے گا۔“

بیگم نے بڑے ملکوتی انداز کے ساتھ کہا۔ ”اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا فیاض بھائی کہ جب اس قصے کو ظاہر کرنے کے بعد اپنی آنکھوں میں انفعال پیدا کر کے رہ جائیں گے، اس وقت میں کیا کروں گی۔“

نازو نے برا مان کر کہا۔ ”تم چاہے مجھ سے لکھوا لو کہ تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ الٹی انہیں کی للو پتو شروع کر دو گی۔ میں سچ کہتی ہوں تمھاری قسم کی عورتوں نے تو ان مردوں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ خدا کی قسم پسلیاں چیر کے کلیجہ نکال لے اپنے ہاتھ سے، گلا گھونٹ کے مر جائے مگر ایسے مردوں کی نام پر تھوکنا بھی نہ چاہیے۔“

فیاض صاحب نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ بلا وجہ مجھ کو دھمکا رہی ہیں حالانکہ نہ میرا ارادہ دوسری شادی کا ہے اور نہ میں اپنے نام پر آپ سے تھکوانے کے حقوق سے دست بردار ہو سکتا ہوں۔“

نازو نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”خیر تم اپنی نہ کہو۔ تمھیں پوچھے گا کون۔ اس قابل ہوتے تو تم بھی کون سی کسر اٹھا رکھتے۔“

فیاض نے گویا سچ بولتے ہوئے کہا۔ ”کیوں صاحب اگر ہم کسی قابل نہ تھے تو یہ جناب سے کس نے کہا تھا کہ چھپ چھپ کر خط لکھا کریں۔ رومال کے اوپر نام کاڑھ کر بھیجیں۔ آخری خط میں یہ لکھ دیں کہ خدا کے لیے شادی کا پیغام بھیجو ورنہ میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔“

نازو نے یہاں سے جانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کچھ پی تو نہیں گئے ہو۔ ایسے ہی تو بے چارے حسین تھے کہ میں ان کے لیے کچھ کھا کے سو رہتی۔ سب سے پہلے پھنداں خالہ کہ یہاں میں نے دیکھا تھا کہ جب چھالٹین کا تھان بغل میں

دبائے ہوئے آئے تھے پاجامے سلوانے، میں سمجھی کہ شاید کوئی بزاز وزاز ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ بڑے ہو لو نظر آ رہے تھے۔ اب چاہے مکر جاؤ مگر تم نے گھبرا کر مجھے سلام کر لیا تھا۔ اشو نے بتایا یہ فیاض بھائی ہیں۔“

فیاض نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اسی دن تو پہلا تیر کھایا ہے، کیا معلوم تھا کہ یہی تیر انداز صاحبہ جان کا عذاب بن کر رہ جائیں گی۔ میں نے کہا۔ سنتی ہو تم ہماری شادی نہیں کہیں ٹھہرا سکتیں۔“

نازو نے اسی تیزی سے کہا۔ ”اے کیوں نہیں چاند سی دلہن لاؤں گی تمھاری۔ دھوم سے تمھاری برات لے کر جاؤں گی اپنی سوت لانے کے لیے۔ ایسا ہی ارمان ہے تو کیوں نہیں کر لیتے شادی، منع کون کر رہا ہے۔“

فیاض نے بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ رہی ہو ان کا کیا حال ہے۔“

نازو نے کہا۔ ”یہ تو ہیں بے وقوف۔ نہ ہوئی میں ان کی جگہ اگر مزہ نہ چکھا دیا ہوتا تو نام بدل دیتی۔“

بیگم نے پھر بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کہتی ہوں تم دونوں اتنے لڑاکے کیوں ہو۔ ایک ہم میاں بیوی ہیں کہ اتنی بڑی بات ہو رہی ہے مگر کیا مجال جو ہم دونوں میں لڑائی کے نام کی آدھی بات بھی ہوئی ہو۔“

نازو نے بیگم کی طرف سے رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”نہ تو میں تمھاری طرح فرشتہ اور نہ خدا کرے ایسی زبان۔ میرے ساتھ اگر یہ ایسا سلوک کریں تو میں بھی ان کو مزہ چکھا کے رکھ دوں اور میں تم سے بھی کہتی ہوں کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ یہ چپکے چپکے جو تم گھل رہی ہوں اس سے آخر کیا فائدہ۔ ان کو بھی تو کچھ سزا ملنا چاہیے۔“

فیاض نے بڑی ہمدردی کے ساتھ کہا۔ ”سزا تو خیر کیا ملنا چاہیے مگر ہاں یہ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ عین شادی کے وقت میں آپ کو لے کر دہاں پہنچ جاؤں گا۔ تا کہ دولہا میاں کی سراسیمگی کا تماشا تو دیکھا جائے۔ مگر آپ سے وہ منظر کیسے دیکھا جائے گا۔“

بیگم نے بڑی جرأت کے ساتھ کہا۔ ”کیوں؟ دیکھا کیوں نہیں جائے گا؟ فیاض بھائی مجھ پر جو تکلیف گزرنا تھی گزر چکی۔ اب تو میں کلیجے پر پتھر رکھ ہی چکی ہوں۔ آپ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے ایک دم سے نکاح کے وقت لے کر پہنچ جائیں گے۔“

فیاض نے منہ مانگی مراد پائی۔ مگر بظاہر اپنے کو نہایت شش و پنج میں مبتلا کر کے کہا۔ ”کیا بتاؤں بھابی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھی بات ہے، میں آپ کے لیے اپنے نہایت عزیز دوست کی خفگی بھی مول لے لوں گا۔“

نازو نے کلائی پر نظر ڈال کر کہا۔ ”افوہ دس بج رہے ہیں۔ اب چلنے کا ارادہ بھی ہے، یا نہیں، اٹھیے بس اب۔“

آج ان لوگوں نے ہم کو بڑی دیر تک کمرے میں بند رکھا۔ چنانچہ ان کے جانے کے بعد جب ہم باہر آئے ہیں تو کلب جانے کا وقت بھی نہ تھا۔ مجبوراً تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہل کر وقت گزارا تا کہ سرِ شام گھر پہنچنے کا الزام ہم پر نہ لگایا جا سکے اور ہماری وضع داری کے دامن پر یہ دھبہ نہ لگے کہ ہم ایک دن صحیح وقت پر آ گئے تھے۔

(۲۱)

بھارتی صاحب کے یہاں کھانے پر جس وقت ہم پہنچے ہیں۔ تو وہ بے چارے غالباً ہمارے ہی انتظار میں اپنی کوٹھی کے برآمدے میں شٹنگ کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی ”آیئے“ کا نعرہ بلند کیا اور ایک مرتبہ ٹھہرے پھر گھبرا کر کمرے کے اندر گھس گئے اور اب کمرے کے اندر ہی سے آواز دی۔ ”آپ لوگ بیٹھئے میں ذرا لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔“

ہم لوگ ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چپکے چپکے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے کہ اتنے میں شیلا نے آ کر چپکے سے فیاض کے کان میں کہا۔ ”ڈنر سوٹ پہن رہے ہیں۔“ اور اس جملے کے ختم ہونے کے بعد بھارتی صاحب اپنا عالمِ شباب کا بنوایا ہوا ڈنر سوٹ پہن کر۔ جواب تقریباً ان کا ہم عمر ہو چکا تھا، باہر تشریف لائے اور اپنے نزدیک معذرت طلب کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بات یہ ہے کہ میں یہ بات گویا بھول گیا تھا کہ کھانے کے لیے ایک وردی بھی ہوا کرتی ہے۔ آپ لوگوں کو کھانے کے خاص لباس میں دیکھ کر مجھے بھی آج سات سال کے بعد یہ لباس پہننے کا اتفاق ہوا۔ بڑی دیر تک بو (Bow) باندھنے کا طریقہ ہی سمجھ میں نہ آیا۔ تو خیر اس روز میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ آپ حضرات کی الگ الگ تعریف کیا ہے۔“

فیاض نے سب سے پہلے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اس خاکسار کو

فیاض احمد کہتے ہیں۔“

بھارتی صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آج کل آپ کے علامہ مشرقی کہاں ہیں۔ میں ان کے متعلق بہت بلند رائے رکھتا ہوں۔“

فیاض نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”خاکسار سے میری مراد کمترین سے تھی۔“

بھارتی صاحب نے ایک دم سے کہا۔ ”اوہ تو خیر ہاں تو آپ نے کیا نام بتلایا؟“

فیاض نے کہا۔ ”میرا نام فیاض احمد ہے اور سول سیکرٹریٹ میں ملازم ہوں۔ آپ میرے دوست شکوہ صاحب ہیں۔ آپ یہاں کے انکم ٹیکس آفس میں اسسٹنٹ انکم ٹیکس افسر ہیں۔“

بھارتی صاحب نے جو اپنے کمرے کی ایک تصویر دیکھنے میں نہ جانے کیوں مشغول تھے۔ ”اس قسم کی تصویریں مصور کے دستاویزی جھوٹ کا نمونہ ہوتی ہیں یعنی یہ تصویر کسی حالت میں بھی سچی نہیں ہوسکتی۔ یہ عورت دریا کے اندر پیر لٹکائے بیٹھی ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ دریا اس کے پیر کے مقابلہ میں چھوٹا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے بہت کم عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ دریا میں پیر لٹکا کر بلاوجہ بیٹھی رہیں۔ بہرحال تو آپ نے کیا فرمایا تھا کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں۔ غالباً کچھ انکم ٹیکس کی بات تھی۔ میں نے دو سال تک انکم ٹیکس کا مقدمہ لڑا ہے اور اب بارہ سو روپے سال کی چپت کھا رہا ہوں۔ تو خیر۔ جس وقت آپ لوگوں کو کھانے کی خواہش ہو خانساماں سے کہہ کر منگوا لیجئے گا۔ بات یہ ہے کہ میری بیوی کھانے کی میز پر نہیں آئیں گی۔ ایک تو چھری کانٹے سے کھانا نہیں جانتی ہیں۔ دوسرے ہمارے یہاں کا طریقہ یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ لڑکیاں تو اپنے منگیتر سے نہیں جھینپتیں مگر ساس داماد سے شرمانے لگتی ہے۔ ان

سب کے علاوہ بات یہ ہے کہ آج کل نوجوان میاں کو دیکھ کر بیوی کے لیے رائے قائم نہیں کرتے بلکہ بیوی کو دیکھ کر میاں کے لیے رائے قائم کی جاتی ہے لہٰذا۔ لہٰذا سے میرا مطلب یہ ہے کہ پس میں اپنی بیوی کو آپ کے سامنے لاکر اپنے لیے وہ رائے قائم نہیں کرانا چاہتا جو میری بیوی کو دیکھ کر آپ قائم کرنا چاہیں گے۔ تو خیر، میاں عرفان کے متعلق مجھے ایک بات اور بھی پوچھنا تھی کہ ان کے سیاسی عقائد کیا ہیں۔ کیوں عرفان صاحب آپ کے نزدیک ہندوستان کے واسطے وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ہندوستان کے تمام فرقے اس کو بیک وقت قبول کر لیں۔“

عرفان نے بے کسی کے ساتھ پہلے اپنی اور پھر اپنے دوستوں کی بغلیں جھانکیں اور پھر بھارتی صاحب کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ اتنی دیر میں بھارتی صاحب پچاسوں سوال کر گئے۔ ” کہنے لگے۔ میرے نزدیک تمام ہندوستانیوں کو صرف ایک چیز مطمئن کرسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ آزادی وغیرہ کا نام لینا چھوڑ دیں۔“

عرفان کے منہ سے نکل گیا۔ ”جی ہاں۔“

بھارتی صاحب ایک دم سے برس پڑے۔ ”جی ہاں سے کیا مطلب؟ یعنی آپ کے نزدیک آزادی کے حق سے دست بردار ہو جانا کوئی عمدہ بات ہے۔ یہ آپ نے جی ہاں کہا کیسے جی، ارے صاحب میں پوچھتا ہوں جی۔ تو خیر، میرا خیال یہ ہے کہ آپ کے سیاسی عقائد ڈانواں ڈول ہیں۔ آپ اخبار پڑھتے ہیں؟“

عرفان نے کہا۔ ”جی ہاں۔“

بھارتی صاحب نے فرمایا۔ ”کیوں پڑھتے ہیں آپ اخبار یعنی میرا مطلب یہ کہ کیا نیت ہوتی ہے آپ کی اخبار پڑھتے وقت۔ بہت سے لوگ فیشن کے طور پر اخبار پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگ نشے کے طور پر اخبار کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ معدے کی امداد کے لیے اخبار پڑھتے ہیں تو مدعا یہ ہے کہ آپ کس غرض سے

اخبار پڑھتے ہیں۔“

عرفان نے کہا۔ ”میں دنیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے اخبار پڑھتا ہوں۔“

بھارتی صاحب نے اپنا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر دنیا کا اس سے کیا فائدہ۔ اس کے حالات تو بغیر آپ کے معلوم کیے ہوئے بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ ہوتے ہیں۔ بہر حال آج جو آپ نے اخبار پڑھا اس کی ہیڈ لائن کیا تھی؟“

اخبار پڑھا ہوتا تو بے چارہ ہیڈ لائن بھی بتا سکتا مگر وہاں تو شاید دو تین سال سے اخبار پڑھنے کی نوبت نہ آئی ہوگی۔ آخر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بھارتی صاحب کے تقاضوں سے عاجز آ کر بے چارے نے کہہ دیا۔ ”کچھ یاد نہیں رہی۔“

بھارتی صاحب ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”یاد نہیں رہی کہ مطلب؟ آپ کی یادداشت کا اگر یہی حال ہے تو کچھ دنوں کے بعد آپ اپنی بیوی یعنی میری لڑکی شیلا کے متعلق بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یاد نہیں رہی کیوں جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ تو جوانی میں جب آپ کی یادداشت کا یہ عالم ہے تو میری عمر تک پہنچتے پہنچتے تو شاید اپنا نام بھی بھول جائیں۔ حالانکہ میرا حال یہ ہے کہ مجھے ۱۹۸۹ء کے اخبارات کی سرخیاں اب تک یاد ہیں۔ کیا آپ بھی کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں؟“

عین اسی وقت خانساماں نے آ کر عرفان کی مشکل آسان کر دی اور بھارتی صاحب ”تو خیر“ کہتے ہوئے ہم لوگوں کے ساتھ کھانے کی میز پر آ گئے اور کھانے پر بیٹھنے سے پہلے عرفان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور سے بولے۔ ”ارے بھئی سنتی ہو...... تم کدھر ہو۔ خیر جہاں کہیں بھی ہو، دیکھ لو یہی ہے وہ لڑکا جس کے ساتھ شیلا کی شادی غالباً ہو جائے گی۔“

پھر سب کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو کون سی تاریخ طے کی آپ لوگوں نے۔“

فیاض نے ادب کے ساتھ کہا۔ ”آپ کے ہوتے ہوئے ہم کو تاریخ طے کرنے کا کیا حق ہے۔“

”بھارتی صاحب نے مرغ سے خنجر آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی دو ٹانگیں ہیں۔ ایک تو میں لوں گا۔ ایک کے لیے آپ لوگ فیصلہ کر لیجیے۔ اس قسم کا ایک مرغ غالباً ادھر بھی ہوگا۔ میں کھانے کے سلسلے میں ذرا بے تکلف واقع ہوا ہوں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کھانے پینے میں ذرا تکلف وغیرہ کم کیا کرے۔ تو خیر، میرے نزدیک تاریخ کوئی ایسی ہونی چاہیے کہ بنک میں تعطیل نہ ہو۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور چونکہ ہم لوگوں کو کچھ کرنا نہیں ہے لہٰذا کیوں نہ کل ہی پرسوں یہ فرض پورا کر دیا جائے۔ مسٹر عرفان آپ کے والد کو آسانی کے ساتھ کس روز شرکت کی فرصت ہو سکتی ہے۔“

قبل اس کے کہ عرفان کچھ کہہ گزریں، فیاض نے کہا۔ ”عرفان صاحب اپنے والد کو اس شادی کی اطلاع فی الحال کرنا نہیں چاہتے۔“

بھارتی صاحب نے چونک کر کہا۔ ”کیا مطلب؟ یعنی کیوں اطلاع کرنا نہیں چاہتے؟ یہ شادی غالباً شادی ہے۔ ڈکیتی، خونریزی، چوری یا کوئی بدمعاشی تو ہے نہیں۔“

فیاض نے کہا۔ ”جی ہاں یہ صحیح ہے مگر عرفان صاحب کے والد آپ کی طرح روشن خیال قسم کے بزرگوں میں سے نہیں ہیں اور چونکہ ان کی مداخلت سے عرفان صاحب کو اندیشہ یہ ہے کہ شاید کوئی جھگڑا پیدا ہو۔ لہٰذا وہ یہ چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد ہی ان کو اطلاع ہو تو اچھا ہے۔“

بھارتی صاحب نے مرغ کی ٹانگ پر اپنے مصنوعی دانت تیز کرتے ہوئے کہا۔ ”روشن خیال تو خیر میں بھی نہیں ہوں اور نہ میرے خاندان میں اب تک کوئی روشن خیال گزرا ہے۔ مگر چونکہ شیلا کی طرف سے مجھے اطمینان ہے کہ اگر میں نے خوشی

سے اس کو اجازت نہ دی تو میری ناخوشی کے ساتھ بغیر میری اجازت حاصل کیے شادی کر لے گی۔ لہٰذا میں اس میں عافیت سمجھتا ہوں کہ جو اس کی خوشی ہے وہی میری خوشی ہے۔ اگر یہ اطمینان مسٹر عرفان صاحب اپنے والد کو دلا سکتے تو غالباً ان کو بھی جھک مار کر اجازت دینا پڑتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں وہ جرأت نہیں ہے جو میری لڑکی میں ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ میری لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کر رہے بلکہ میری لڑکی ان کے ساتھ شادی کر رہی ہے۔ لہٰذا میں خوش ہوں کہ بجائے اس کے کہ کوئی میری لڑکی سے شادی کر لیتا خود میری لڑکی کسی سے شادی کر رہی ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا فرق ہے جو میں کسی وقت آپ کو سمجھا دوں گا۔ فی الحال تاریخ طے کیجئے۔ میرے نزدیک کل ہی پرسوں۔ اس وقت تو زیادہ دیر ہو چکی ہے۔ ورنہ یہی کھانا شادی کا کھانا بن سکتا تھا۔ میرے نزدیک شادی بس اسی طرح ہونا چاہیے جیسے آدمی کو پیاس لگی اور اس نے اٹھ کر پانی پی لیا۔ تو فرمایئے کل یا پرسوں؟"

فیاض نے کچھ ہم سے مشورہ کیا اور کچھ عرفان سے پوچھا اور آخر کھانے کے اختتام پر پرسوں کے متعلق بڑے میاں سے کہہ دیا، جس کو وہ تو گویا پہلے ہی سے طے کیے بیٹھے تھے۔ تاریخ کے اس تعین کے بعد ہم لوگوں کو وہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

(۴۲)

کلب میں آج خاصی چہل پہل تھی، اس لیے کہ بھارتی صاحب سے رسمی طور پر اجازت لینے کے بعد شادی کا انتظام ہم لوگوں نے اسی جگہ کیا تھا جہاں یہ تحریک پیدا ہوئی اور نشو و نما پا کر پروان چڑھتی تھی۔ فیاض کی ذمہ داریوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ بوکھلائے ہوئے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ رمیش کے سپرد سجاوٹ کا انتظام تھا۔ اخلاق دن ہی کو عرفان اور شیلا کے قانونی نکاح کے سلسلے میں تمام خانہ پری کر چکے تھے۔ شعیب ایک کونے میں بیٹھے سہرا لکھ رہے تھے اور ہم اس سلسلے میں شادی کے خیال سے خالی الذہن ہو کر خود اپنے متعلق سوچ رہے تھے کہ نکاح کے وقت نازو اور رفو جب ہم کو دولہا بنا ہوا دیکھنے کی بجائے عرفان کو اس کیفیت میں دیکھیں گی تو ان کی حیرت بجائے خود کیسا دلچسپ تماشا ہو گی۔ تمام دن اسی تخیل اور تصور میں بمشکل تمام کاٹا اور شام کو جب تمام کلب کے ممبر جمع ہو گئے اور بھارتی صاحب بمعہ مسز بھارتی کے تشریف لے آئے تو فیاض نے ہم سے کہا۔ "اب میں جاتا ہوں۔ نازو اور بھابی کو لے آؤں نا؟"

ہم نے کہا۔ "جاؤ ضرور لے آؤ۔ بس اب انہی کا انتظار ہے۔"

فیاض نے کہا۔ "شیلا سے ان کو تم خود ملانا۔ دولہا سے بعد میں، میں ملا دوں گا۔"

ہم لوگوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فیاض کا ملازم امام بخش آتا ہوا دکھائی

دیا۔ ہم نے فیاض سے کہا۔ ”خیریت تو ہے، امام بخش آرہا ہے۔“

فیاض نے کہا۔ ”غالباً وہ لوگ خود آ گئے۔“ اور یہ کہہ کر پھاٹک کی طرف لپکا اور ہم شیلا کو بلانے کے لیے کلب کے ہال میں چلے گئے۔ جس وقت ہم شیلا کو لے کر آئے ہیں۔ بیگم اور نازو سیڑھیوں تک آ چکی تھیں۔ ہم نے بیگم کو آتے ہی کہا۔ ”ارے تم!“

بیگم نے طنز کے ساتھ مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں آپ کی صرف شریک غم ہی نہیں بلکہ شریک مسرت بھی ہوں۔“

ہم نے شیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شیلا ان سے ملو۔ یہی ہیں میری شریکِ غم جو فرما رہی ہیں شریکِ مسرت بھی ہوں۔ گویا بحیثیت مجموعی عذابِ زندگی ہیں۔“

بیگم نے انتہائی ضبط کرتے ہوئے مگر غصے سے کانپ کر کہا۔ ”ان سے کیوں کہہ رہے ہیں جو کچھ کہنا ہے مجھے کہیے نا۔“

نازو نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اے واپس چلیں نا۔ دراصل آپ کو یہاں آنا ہی نہ چاہیے تھا۔“

شیلا نے دو دو کر کے چاروں سیڑھیاں پھاند کر بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیوں واپس جانا چاہتی ہیں کیا بات ہوئی آخر، میں آپ کو نہ جانے دوں گی۔“

بیگم نے شیلا کی طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اور تم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ کشتی تمھیں کنارے لگانا چاہتی ہے اور مجھے ڈبونا۔“

شیلا نے بغیر سمجھے ہوئے کہا۔ ”بیوٹی فل، کتنا اچھا جملہ کہا آپ نے مگر کیوں

کہا ہے۔“

نازو نے جل کر کہا۔ ”اللہ ری نا سمجھی، جیسے بے چاری کچھ جانتی نہیں ہیں۔“

شیلا نے بھونچکا ہو کر نازو کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا بات ہے۔ بیگم نے اپنے کلیجے کی ہوک کو الفاظ کے بھیس میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمھاری ایک ادنیٰ پرستار ہوں، اس لیے کہ جس کی پرستش میرا فرض ہے وہ خود تمھارا پرستار ہے۔“

شیلا نے پھر حماقت کا ثبوت دیا۔ ”کیا یہ کسی ڈرامے کے ڈائیلاگ ہیں؟“

اتنے میں فیاض نے آ کر اس گفتگو کا سلسلہ فی الحال ختم کر دیا، اور آتے ہی کہا۔ ”کہیے بھابی آپ ہماری نئی بھابی سے ملیں؟ اور شیلا بتاؤ تو ان میں سے کون سی میری بیوی ہے اور کون سی بھاوج؟“

شیلا نے کہا۔ ”مجھے تو دونوں ہی اچھی لگ رہی ہیں۔ اصل میں تم ان دونوں میں سے کسی کے قابل نہ تھے۔“

فیاض نے کہا۔ ”یہ تو آپ سچ کہتی ہیں قابل تو میں صرف آپ کے تھا مگر آپ نے تو مجھے پوچھا ہی نہیں۔ بہر حال حاضر میں حجت نہیں جیسے کچھ بھی ہیں، یہ ہیں میری بیوی نزہت جس کو میں نازو کہتا ہوں اور یہ ہیں آپ کے شوکی کی بیگم رفعیہ سلطانہ جن کو شوکی صاحب مارے لاڈ کے رفو کہتے ہیں اور خود جانے اس وقت کہاں رفو چکر ہیں۔“

نازو نے اسی تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ بے چارے زیادہ دیر تک آنکھ چار نہیں کر سکتے۔ نئی دلہن کی خوشامد میں ان کو زندگی کا عذاب ہی تک کہنے پائے تھے کہ غالباً اس کے بعد ہمت نہ ہوئی۔“

شیلا نے حیران ہو کر کہا۔ ”میری خوشامد میں۔“

فیاض نے غالباً یہ سمجھ کر کہ راز افشاء ہونے ہی والا ہے، بیگم اور نازو کو ساتھ لیا

اوراس کمرے میں آ گیا جہاں تقریب میں شرکت کرنے والے مہمان دولہا کو گھیرے ہوئے بیٹھے تھے۔ بیگم نے دولہا کو دیکھا اور دیکھنے کے باوجود نہ پہچان سکی۔ دل کے یقین نے آنکھوں سے وہی دکھایا جو وہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھیں۔ یہاں تک کہ فیاض نے خود ہمارے سامنے کہا۔

''آیئے بھابی، دلہن سے تو آپ مل چلیں اب دولہا سے بھی مل لیجئے۔''

بیگم نے اپنی ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا۔ ''زندگی بھر مل چکی ہوں۔ اب کیا کروں گی مل کر۔''

فیاض نے زور دیا۔ ''ملئے تو سہی۔ آپ کو شرمندہ کرنے کا وقت تو یہی ہے۔

''ہم پاس ہی کھڑے مسکرا رہے تھے مگر لطیفہ یہ تھا کہ نازو، رفو دونوں گردنیں جھکائے بت بنی تھیں اور دونوں میں سے کوئی ہمیں دیکھنے کو گویا تیار ہی نہیں تھا۔ آخر فیاض کی زبردستی سے بادلِ ناخواستہ بیگم اور نازو نوشاہ تک گئیں اور جب عرفان نے گڑبڑا کر کہا۔ ''ارے آپا'' تو حیرت کا ایک تماشہ تھیں بیگم اور دوسرا مرقع تھیں نازو مگر خود دولہا میاں حیرت کا کارٹون بنے ہوئے کھڑے تھے۔ دو منٹ کی مسلسل خاموشی کے بعد بیگم نے فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آخر کیا معمہ ہے؟''

فیاض نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس معمے کا حل یہ بدمعاش ہے، جو آپ کے پیچھے کھڑا ہنس رہا ہے۔''

بیگم نے گھوم کر ہم کو دیکھا تو ہم نے نہایت ادب سے سلام کیا مگر نازو۔ اور نازو سے زیادہ شیلا فیاض کے سر تھیں کہ آخر یہ بھید کیا ہے۔ اگر یہ کوئی مذاق ہے تو اب ختم کیجئے اسے۔

نازو نے رفو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیاض سے کہا۔ ''بہت بری بات ہے فیاض۔ رفو اس وقت اس عالم میں نہیں ہیں کہ تم اس طرح کا مذاق کرو۔''

فیاض نے ان دونوں کو سمجھانے کی اجازت نظروں ہی نظروں میں ہم سے طلب کی۔ ہم اس کو اجازت دیتے ہوئے بیگم کو ساتھ لے کر لان کے اس گوشے میں آ گئے جہاں شیلا نے پہلی مرتبہ ہم کو شکوہ کی بجائے شوکی کا خطاب دیا تھا۔ اور بیگم کو گھاس کے اوپر دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''بدگمان عورت کی میرے نکاح میں شرکت۔''

بیگم نے اسی لب ولہجہ سے کہا۔ ''بدزبان مرد، دیکھی ایک عورت کی جسارت مگر سب سے پہلے سمجھایئے کہ یہ قصہ کیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں۔ بیداری ہے یا خواب۔''

ہم نے بیگم کو ستا ستا کر، گدگدا، گدگدا کر شروع سے آخر تک کی تمام داستان دس پندرہ منٹ کے اندر سنا دی اور عین اس وقت جب کہ بیگم بڑے دلار سے ہمارے بالوں سے کھیل کھیل کر فرما رہی تھیں۔ ''افوہ رے چور۔''

پیچھے کی جھاڑیوں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، اور شیلا نے بڑے زور سے کہا۔ ''اللہ ری ساہوکار۔''

''بیگم دوڑ کر شیلا سے لپٹ گئیں۔ ہم فیاض کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ فیاض کا ہاتھ نازو کے شانے پر تھا اور عرفان کھڑے ہوئے انگوٹھا چوس رہے تھے کہ یکا یک بھارتی صاحب کی آواز آئی۔

''تو آخر میرا مطلب یہ ہے کہ کیا واہیات ہے۔ یعنی مہمان کچھ اونگھ رہے ہیں اور کچھ سو کھ رہے ہیں۔ وہ تین آدمی میری بیوی کو دیکھ دیکھ کر اب تک ہنس چکے ہیں اور تم لوگ یہاں غالباً کچھ خوش فعلیاں کر رہے ہو۔ میری رائے میں سب کو وہیں جانا چاہیے تا کہ میری بیوی کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹے۔ وہ اگر موٹی ہیں تو اس کی شکایت مجھے ہونا چاہیے، کسی اور کو ہنسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ ننانوے فیصدی عورتوں کا مستقبل یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر میں پہنچ کر عمارت بن جایا کرتی ہیں۔ آپ

سے پوچھتا ہوں کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنا، فیاض وغیرہ تھا، آپ ہی بتائیے کہ یہ بات ایک موٹی عورت کے شوہر کے شرمندہ ہونے کے لیے کافی ہے یا نہیں۔ خواہ یہ موقعہ اس کی بیٹی کی شادی ہی کا کیوں نہ ہو۔"

فیاض نے سب کو محفل میں چلنے کا اشارہ کیا جہاں واقعی مسز بھارتی اس طرح بیٹھی ہوئی تھیں گویا دولہا اسی ہاتھی پر آیا ہے۔

ختم شد